جلد ۱۱ شمارہ ۴ اپریل ۱۹۹۹ء ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ

فہرست

اس شمارے میں

اس شمارے میں	محمد بلال	۲

شذرات

تب کیا ہوگا.....	محمد بلال	۵

قرآنیات

البیان: البقرہ ۲: ۲۶-۲۹ (۶)	جاوید احمد غامدی	۱۰

معارف نبوی

تصور توحید	طالب محسن	۱۳
خدا کی اولاد	طالب محسن	۱۸
متفرق دعائیں	ساجد حمید	۲۱

دین و دانش

اصول و مبادی (۱۱)	جاوید احمد غامدی	۲۵
قانون دعوت (۱)	جاوید احمد غامدی	۲۸
التزام جماعت ـــــ اعتراضات کا جائزہ (۴)	معز امجد	۳۴
تختِ سلیمان کے دھڑ کی حقیقت	محمد رفیع مفتی	۴۲

ملاقات

جناب عبدالستار غوری سے ایک مکالمہ	نعیم احمد بلوچ	۶۵

ادبیات

فریادی (افسانہ)	طالب محسن	۷۸
غزل	جاوید احمد غامدی	۸۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس شمارے میں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال سے مکہ میں تبلیغ کر رہے ہیں۔ دین کی حمیت کا جذبہ سب سے بڑھ کر آپ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ آپ کے ساتھی آپ کے اشارۂ ابرو پر جان لینے اور جان دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ایمان کے دوسرے درجے پر ہوں، یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہ معلوم ہے کہ شرک تمام برائیوں میں سب سے بڑی برائی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیت اللہ، بت کدہ بنا ہوا ہے، غیر اللہ کو پکارا جا رہا ہے، اہلِ توحید کو مارا جا رہا ہے، لیکن آپ ان بتوں کے خلاف کوئی طاقت استعمال نہیں کر رہے، مشرکین کے خلاف کوئی مسلح کارروائی نہیں کر رہے، اہلِ توحید پر ظلم کرنے والوں پر کوئی جوابی حملہ نہیں کر رہے۔

دوسرے انبیا کو دیکھیں۔ موسیٰ علیہ السلام ہی کو لیں۔ پرُ جلال مزاج رکھتے ہیں۔ ان کا مخاطب فرعون ہے۔ وہ بدترین برائیوں کا مرتکب ہے۔ لیکن آپ اس کے خلاف کوئی مسلح اقدام نہیں کر رہے۔ لوط علیہ السلام کی قوم ایک بہت بڑی برائی میں ملوث ہے۔ لیکن آپ اسے نصیحت ہی کر رہے ہیں، کوئی سخت قدم نہیں اٹھا رہے۔ مسیح علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل ہے۔ اس نے خدا کے گھر کو چوروں کا بھٹ بنا دیا ہے۔ حواریوں کے ساتھ اگر ساتھی بھی ملا لیے جائیں تو ایک بڑی تعداد آپ کے ساتھ ہے، لیکن آپ اس قوم کو زبان ہی کے ذریعے سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان پر کسی قسم کی کوئی یلغار نہیں کر رہے۔

بلکہ صورتِ حال یہ ہے کہ انبیا پر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ انھیں قتل کیا جا رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھائے جا رہے ہیں۔ جسمِ مبارک پر نجاست ڈالی جا رہی ہے۔ تین سال کے لیے آپ کو شعبِ ابی طالب میں محصور کر دیا گیا ہے۔ اس دوران میں آپ پتے کھا کر گزارہ کر رہے ہیں۔ طائف کی گلیوں میں آپ پر اتنے پتھر برسائے گئے ہیں کہ جوتیاں خون سے بھر گئی ہیں۔ اور اس کے ساتھ گالیاں بھی دی گئی ہیں اور تالیاں بھی بجائی گئی ہیں۔ یرمیاہ نبی کو رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیا گیا ہے۔ ذکریا علیہ السلام کو عین ہیکلِ سلیمانی میں سنگ سار کر دیا گیا ہے۔ یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے ایک رقاصہ کو پیش کر دیا گیا ہے۔ لیکن کوئی نبی (جب تک اسے سیاسی اقتدار نہیں مل گیا) برائی اور بروں کے خلاف طاقت استعمال نہیں کر رہا۔

لیکن ہمارے ہاں صورتِ معاملہ اس سے بہت مختلف ہے۔ ہمارے ہاں غلبۂ دین کی جدوجہد کرنے والے مذہبی قائدین (جن کے پاس سیاسی اقتدار نہیں ہے) لوگوں کو طاقت کے ذریعے سے برائی ختم کرنے پر اکسا رہے ہیں جبکہ ان کے کارکن تو برائی کو ہاتھ سے ختم کرنے کے لیے ایک عرصے سے میدانِ عمل میں اترے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں پر نہ صرف یہ کہ جوابی وار کر رہے ہیں بلکہ اقدامی وار بھی کر رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایسے صالحین معاشرے میں سخت ناپسند کیے جا رہے ہیں اور بدمعاش اور غنڈے کے نام سے یاد کیے جا رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال حیران بھی کرتی ہے اور پریشان بھی۔

اگر اس مسئلے کی تہ میں اتریں اور اس عمل کی بنیاد میں پائے جانے والے علم کو تلاش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ اپنے جارحانہ عزائم اور اقدام کا جواز پیش کرتے ہیں۔ وہ بہت سے دلائل دیتے ہیں۔ ایک دلیل وہ یہ دیتے ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے برائی کو روکنے کو ایمان کا پہلا درجہ قرار دیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ حدیث کو سمجھنا اور اس سے مسائل اخذ کرنا ایک بے حد مشکل علم و فن ہے۔ دین کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے انبیا کی ساری سیرت سے اعراض کر کے، صرف ایک حدیث پر اپنے نقطۂ نظر کی بنیاد رکھنا، دنیا اور آخرت دنوں پہلوؤں سے بڑے سنگین مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ اور چونکہ یہ اعراض کیا جا چکا ہے اس لیے اس کے سنگین نتائج اپنی تمام تر کراہیت کے ساتھ دنیا میں تو سامنے آچکے ہیں اور اندیشہ ہے کہ اس معاملے میں اگر فکر و فلسفہ کی اصلاح نہ کی گئی تو صورتِ حال سنگین تر ہو جائے گی۔

اس وقت ''دین و دانش'' کے ضمن میں جاوید احمد صاحب غامدی کی تحریر ''قانونِ دعوت'' کے ایک ذیلی عنوان 'فرد کی نصیحت' کے تحت مذکورہ حدیث کی شرح کی گئی ہے جس کی غلط تفہیم نے اسلام جیسے دینِ دعوت کو دینِ فساد بنا کر رکھ دیا اور لوگوں کو مذہب کے قریب لانے کے بجائے مذہب سے دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جاوید صاحب کی یہ چھوٹی سی تحریر ہے لیکن اس نے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ بائیبل، تورات، زبور اور انجیل کا مجموعہ ہے۔ قرآنِ مجید کی طرح تورات زبور اور انجیل کے الفاظ کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر نہیں لی تھی۔ اس لیے کمزور انسان ان کی صحیح معنوں میں حفاظت نہ کر سکا۔ اور پھر یہ کتابیں ترجمہ در ترجمہ در ترجمہ.... کے عمل سے گزری ہیں جس سے ان کی افادی حیثیت مزید کم ہو گئی۔ لیکن اس کے باوجود بائیبل کے اکثر مقامات ایسے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی ہے، محبتِ الٰہی دل میں جاگزیں ہونے لگتی ہے اور حکمت و معرفت کی پرتیں کھلنے لگتی ہیں۔ اور اس کے وہ مقامات جہاں حضرتِ انسان

دخل انداز ہوا ہے انھیں اگر قرآنِ مجید کی روشنی میں دیکھ لیا جائے تو وہ کسی طرح غلط راہ پر ڈالنے کا باعث نہیں بن پاتے۔ لیکن اس کے باوجود بائیبل کو پڑھنے کا رجحان ہمارے ہاں بہت کم ہے۔ اور بائیبل کے بڑے اسکالرز تو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

جناب عبدالستار غوری کا انٹرویو اس اشاعت میں ''ملاقات'' کے تحت طبع کیا گیا ہے۔ غوری صاحب بائیبل کے ایک بڑے اسکالر ہیں۔

ہم انٹرویو کے لیے شخصیت کا انتخاب کرتے ہوئے اس کی شہرت کو پیشِ نظر نہیں رکھتے، بلکہ اس کے کسی علم و فن میں یا کسی اور پہلو سے بڑے ہونے کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ یہی چیز اس ''ملاقات'' کے لیے غوری صاحب کی وجۂ انتخاب بنی ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایسے مشہور لوگوں کی کمی نہیں ہے جن سے ملاقات کے بعد یا ان کی باتیں سننے یا پڑھنے کے بعد وقت کے ضیاع کا احساس بڑی شدت سے پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ''شذرات''، ''قرآنیات''، ''معارفِ نبوی'' اور ''ادبیات'' کے سلسلے حسبِ سابق موجود ہیں۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تب کیا ہو گا.....

یہ ۲۰ فروری ۱۹۹۹ کی بات ہے۔ میں اپنی موٹر سائیکل پر دفتر آ رہا تھا۔ صبح کے نو بجنے والے تھے۔ میں ابھی والٹن روڈ پر پیکجز لمیٹڈ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ دیکھا ایک کار نے اچانک یوٹرن لیا ہے۔ مجھے اس کار والے پر بہت غصہ آیا کہ اس نے عین سڑک کے درمیان اچانک یہ حرکت کیوں کی۔ اس سے کوئی حادثہ ہو سکتا تھا۔ مجھے ایک ذہنی جھٹکا لگا۔ بہر حال، خراب موڈ کے ساتھ میں تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا تو دیکھا کہ کچھ مزید گاڑیاں یوٹرن لے رہی ہیں۔ میں نے دیکھا، ''قینچی'' کے موڑ پر بہت سے لوگ جمع ہیں۔ اس ہجوم کے پس منظر میں دھواں اٹھ رہا ہے۔ مزید آگے بڑھا تو دیکھا تمام بسیں، کاریں، موٹر سائیکلیں، سائیکلیں واپس مڑ رہی ہیں۔ ایک آدمی نے واپس آتے ہوئے، آگے بڑھنے والے لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''جماعتِ اسلامی والے آگے نہیں جانے دے رہے۔'' صورتِ حال فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔ اس دن بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے وزیر اعظم پاکستان سے صلح و سلامتی کی بات کرنے لاہور آنا تھا۔ جماعتِ اسلامی کو ان کی یہ آمد گوارا نہ تھی۔ وہ اس پر اپنے ہی انداز سے احتجاج کر رہی تھی۔ اس ساری صورتِ حال میں اگرچہ والٹن روڈ پر موجود مسافروں کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن وہ سب اس وقت جماعتِ اسلامی کے زیرِ عتاب تھے۔

میرا دفتر جانا بہت ضروری تھا۔ قریب ہی ایک کالونی تھی۔ اس کی گلیاں اندر ہی اندر سے مجھے فیروز پور روڈ پہنچا سکتی تھیں۔ لہٰذا میں نے اپنی گاڑی ادھر موڑ لی۔ وہاں پہنچا تو دیکھا یہ غیر معروف راستہ خاصا معروف ہو چکا ہے۔ وہاں بہت رش تھا۔ ٹریفک وہاں رینگ رہی تھی۔ بہت سی گدھا گاڑیاں بھی وہاں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے اس وقت لوگوں کے چہرے دیکھے۔ پریشانی کے تاثرات وہاں نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ اس وقت ایک

کار میں ایک پریشان بچے پر نظر پڑی تو اس پر بہت رحم آیا۔ تھوڑا سا آگے بڑھا تو دیکھا ایک موٹر سائیکل سوار کے پیچھے ایک خاتون بیٹھی ہوئی ہے اور آگے ٹینکی پر ایک بچہ۔ یہ بچہ صرف پریشان ہی نہیں، حیران بھی تھا۔ اس بچے کو نہیں معلوم تھا کہ واجپائی کون ہے اور جماعتِ اسلامی کون۔ لیکن اسے یہ معلوم تھا کہ وہ اس وقت تکلیف میں ہے۔ اور یہ تکلیف پہنچانے والے اپنے ہی لوگ ہیں۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اور اس وقت یقیناً اس کے اندر فطری طور پر تکلیف پہنچانے والوں کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی ہو گی۔ ان لوگوں کے خلاف نفرت جو یہ شکوہ کرتے رہتے ہیں کہ اس ملک کے لوگ ہمیں پسند نہیں کرتے۔ ہمیں ووٹ نہیں دیتے۔

بہر حال جیسے تیسے مسافر آگے بڑھ رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے کوٹ لکھپت کے ریلوے پھاٹک تک پہنچا۔ پھلوں کی منڈی میں داخل ہوا۔ فیروز پور روڈ قریب ہی تھی۔ اس وقت اس منڈی میں بھی بہت بھیڑ تھی۔ میں نے دیکھا، کچھ لڑکوں نے لمبے لمبے بانس اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا، مزدور ہوں گے۔ لیکن جیسے ہی اس مقام کے قریب پہنچا جہاں سے میں نے فیروز پور روڈ پر آنا تھا تو دیکھا، وہ لمبے لمبے بانس افقی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ مین روڈ پر جانے کا راستہ ان بانس بردار لڑکوں نے بند کر دیا ہے۔ وہاں اور بہت سے لڑکے بھی ہیں جنھوں نے ہاتھ میں ڈنڈے پکڑے ہوئے ہیں۔ یعنی جو آدمی ان کی بات ''مہذب'' طریقے سے نہ مانے اسے ڈنڈے کے زور پر ماننے پر مجبور کیا جائے گا۔

اب گاڑیوں کے یوٹرن لینے کا سلسلہ یہاں بھی شروع ہو گیا۔ بعض گاڑیوں میں خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ بہت سی کاروں کے لیے یوٹرن لینا ناممکن ہو چکا تھا۔ ایسے لوگوں کی حالت تو بہت قابلِ رحم تھی۔

میں جس ''غیر معروف'' راستے سے آیا تھا اب اسی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ کوٹ لکھپت ریلوے پھاٹک کے پاس میں نے ایک کار والے کو دیکھا۔ اس نوجوان کے کپڑے، عینک، کلین شیو اور بیٹھنے کا اسٹائل بتا رہا تھا کہ یہ مغربی طرزِ معاشرت کو پسند کرتا ہے۔ ایسے لوگ بالعموم مذہبی لوگوں سے بیزار ہوتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ نوجوان انھی لوگوں میں سے ہے تو آج اس کی بیزاری نفرت میں تبدیل ہو گئی ہو گی۔

میں مزید آگے آیا۔ کچھ کاریں پھلوں کی منڈی کی طرف آ رہی تھیں۔ ایک گدھا گاڑی والا جو لوٹ رہا تھا اس نے کار والوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا: وہ شیشے توڑ رہے ہیں۔

جب میں والٹن روڈ پر پہنچا تو دیکھا وہاں ایک بس کھڑی ہے۔ اس میں بے بس سواریاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ بس

کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس کے لیے یوٹرن لینا بھی مشکل ہے اور گلیوں میں جانا بھی دشوار۔ سچی بات ہے بس کے مسافروں کو دیکھا تو ان پر بہت ترس آیا اور ان پر ظلم کرنے والوں پر غصہ۔

اس سارے علاقے میں پولیس تو در کنار، ٹریفک کا ایک سپاہی بھی نظر نہ آیا۔ یہاں حکومت نے بھی اپنی نااہلی کا اچھا مظاہرہ کیا۔

تیسرے دن ایک صاحب نے بتایا کہ میں بھی اس دن اس راستے کی طرف گیا تھا جو جماعتِ اسلامی کے لوگوں نے بند کیا ہوا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں وہاں سے گزرنے لگا تو ان لوگوں نے مجھے روکا۔ میں نے گزرنے پر اصرار کیا تو انھوں نے کہا: ہم تو آج یہاں سے ایمبولینس بھی گزرنے نہیں دے رہے۔

واجپائی کی لاہور آمد اور اعلانِ لاہور کے کئی پہلو ہیں۔ اس پر کئی جہتوں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ یہ بحث بھی کی جا سکتی ہے کہ واجپائی کی آمد کی وجہ امن کی خواہش ہے یا کوئی گہری سازش۔ لیکن اس میں دو آرا ہو سکتی ہیں۔ یہ بحث بھی کی جا سکتی ہے کہ واجپائی کی آمد سے مسئلۂ کشمیر حل ہونے کا عمل تیز ہو گا یا پہلے سے بھی سست ہو جائے گا۔ اس میں بھی دو آرا ہو سکتی ہیں۔ یہ بحث بھی کی جا سکتی ہے کہ ہم نے بھارت کے لیے دشمن ہی بنے رہنا ہے یا اس کے لیے داعی بننے کے امکانات بھی پیدا کرنے ہیں۔ اس میں بھی دو آرا ہو سکتی ہیں۔ یہ بحث بھی کی جا سکتی ہے کہ مسئلۂ کشمیر میدانِ جنگ میں حل کرنا ہے یا کسی میز کے گرد بیٹھ کر۔ اس میں بھی دو آرا ہو سکتی ہیں۔ اس پر بھی بحث کی جا سکتی کہ اعلانِ لاہور میں سیاسی جنگ پاکستان نے جیتی ہے یا بھارت نے۔ اس میں بھی دو آرا ہو سکتی ہیں۔ اس پر بھی بحث کی جا سکتی ہے کہ پاکستان مسئلۂ کشمیر کے بارے میں اپنے اصولی موقف سے دست بردار ہو گیا ہے یا اس نے اس معاملے میں ایک کامیابی حاصل کی ہے۔ اس میں بھی دو آرا ہو سکتی ہیں۔ یہ بحث بھی کی جا سکتی ہے کہ واجپائی کی اچھی میزبانی کر کے حکومتِ پاکستان نے بے حکمتی کا مظاہرہ کیا ہے یا اپنے اخلاص کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اس میں بھی دو آرا ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات کہ اس موقع پر جماعتِ اسلامی نے جو بے قصور لوگوں کو اذیت پہنچائی اور مہمانوں کے خلاف جو رویہ اختیار کیا وہ اسلامی لحاظ سے، اخلاقی لحاظ سے، معاشرتی لحاظ سے حتیٰ کہ انسانی لحاظ سے انتہائی لایعنی اور انتہائی بے ہودہ تھا، اس میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ جماعتِ اسلامی کو اسلامی لحاظ سے، اخلاقی لحاظ سے، معاشرتی لحاظ سے، حتیٰ کہ انسانی لحاظ سے لوگوں پر اپنی رائے ٹھونسنے اور اسے بزور منوانے کا ہرگز کوئی حق حاصل نہ تھا، اس میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔

ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ایک خاتون نفلی عبادات کا بہت اہتمام کرتی ہے مگر اس کے

ہمسایے اس کے رویے کی وجہ سے بہت تنگ ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ عورت جہنم میں جائے گی۔ مزید دیکھیے ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے ساتھ ایک جگہ سفر کے دوران میں پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے۔ جب لوٹے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہوا ہے جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ ان صاحب نے کہا: یارسول اللہ، یہ میں نے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا بجھاؤ۔ بجھاؤ۔ (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل کر مر نہ جائیں۔) اب کسی کو اذیت پہنچانے کے پہلو سے اس فرمانِ نبوی اور اس سیرتِ نبوی کی روشنی میں جماعتِ اسلامی کا رویہ دیکھیں تو کیا اس کے رویے کے غیر اسلامی ہونے میں دو آرا ہو سکتی ہیں؟

ایک دفعہ مدینہ میں ایک مسلمان سے اس کی کافر والدہ ملنے آئی۔ وہ مہمان تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رہنمائی لی گئی۔ آپ نے فرمایا: اسے بٹھاؤ، اس کی سفر کی تھکان دور کرو۔ مزید دیکھیے، فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان لایا اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اب مہمان کو آرام دینے اور اس کی عزت کرنے کے پہلو سے جماعتِ اسلامی کا ''سلوک'' دیکھیں تو کیا اس سلوک کے غیر اخلاقی ہونے میں دو آرا ہو سکتی ہیں۔

اسوۂ نبی یہ ہے کہ راستے سے انسانوں کو تکلیف پہنچانے والی چیزوں کو ہٹایا جائے۔ اب مسافروں کو راحت پہنچانے کے پہلو سے اس اسوۂ نبی کی روشنی میں جماعتِ اسلامی کا انداز دیکھیں تو کیا اس انداز کے غیر انسانی ہونے میں دو آرا ہو سکتی ہیں۔ یقیناً نہیں۔

جماعتِ اسلامی کے لوگ مذہبی لوگ ہیں۔ ہم بھی مذہبی لوگ ہیں۔ اس پہلو سے یہ لوگ دیگر مذہبی لوگوں کی طرح اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ اس اپنائیت کی وجہ سے ایک تشویش پیدا ہوتی ہے۔ جی ہاں، تشویش۔ اُس وقت کی تشویش جب صور میں پھونک دیا جا چکا ہو گا۔ کشمیر سمیت زمین کا ہر حصہ اپنا یہ وجود کھو چکا ہو گا۔ محاسبۂ اعمال شروع ہو چکا ہو گا۔ سیاسی مسائل کی اصل حیثیت بے نقاب ہو چکی ہو گی۔ اخلاقی معاملات کی اہمیت واضح ہو چکی ہو گی۔ درست مقصد کے لیے ذرائع بھی درست ہی اختیار کیے جا سکتے ہیں، یہ بات مسلم ہو چکی ہو گی۔ میزانِ عدل قائم ہو چکی ہو گی۔ وہ لوگ جنھیں آج آمد و رفت کے حق سے ناجائز طور پر محروم کر کے انھیں گوناگوں نقصانات سے دوچار کیا گیا اور انھیں طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا۔ وہ لوگ جنھیں دکانیں بند کرنے پر ناحق مجبور کر کے انھیں ایک دن کی کمائی سے محروم کیا گیا اور انھیں طرح طرح کے اندیشوں کا شکار

کیا گیا۔ وہ لوگ جن کی گاڑیوں کے شیشے توڑ دیے گئے۔ وہ مزدور جن سے دیہاڑی لگانے کے مواقع چھین لیے گئے وہ آج ہو سکتا ہے کہ کسی خوف سے ایسا کرنے سے گریز کریں، مگر اس دن یہ سب لوگ جماعتِ اسلامی کے افراد کے خلاف مقدمہ کریں گے اور مقدمہ سننے اور اس کا فیصلہ کرنے والا رب ذوالجلال ہو گا..... تو تب کیا ہو گا.....!

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ

(یہ[۵۴] جنت کی تمثیل ہے، اور) اللہ اِس بات سے نہیں شرماتا کہ (کسی حقیقت کی وضاحت کے لیے) وہ مچھر یا اس سے بھی حقیر کسی چیز کی کوئی تمثیل بیان کرے۔[۵۵] پھر جو ماننے والے ہیں،

۵۴۔ یہاں سے آگے آیت ۲۷ تک یہ ایک مناسبِ موقع تنبیہ ہے جو سلسلۂ کلام کے بیچ میں جملۂ معترضہ کے طور پر آگئی ہے۔ یثرب کے مشرکین کو اس میں متنبہ کیا گیا ہے کہ یہود کی پیروی میں وہ تمثیلات کے بارے میں بیہودہ حجت طرازی کا مذاق اپنے اندر پرورش نہ کریں۔ یہ ان کے لیے حق سے محرومی کا باعث بن جائے گا۔

۵۵۔ مطلب یہ ہے کہ جنت اور اس کی نعمتوں کا جو ذکر اوپر ہوا ہے، وہ بہر حال تمثیل ہی کے اسلوب میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت اور دوزخ کے بارے میں جو بات بھی اس دنیا میں سمجھائی جا سکتی ہے، تمثیل ہی کے اسلوب میں سمجھائی جا سکتی ہے، لہٰذا تمھاری نگاہ بھی اصل حقیقت ہی پر رہنی چاہیے، تمثیل کے طور پر جن باغوں اور نہروں کا ذکر ہوا ہے، ان میں الجھ کر نہیں رہ جانی چاہیے۔ اللہ جب کسی حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے تو مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کو بھی مثال میں پیش کر دیتا ہے۔ علم و ہدایت کے جویا اس کی قدر کرتے ہیں، وہ

اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾

وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے جو اُن کے پروردگار کی طرف سے آیا ہے، اور جو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ اِس مثال سے اللہ نے کیا چاہا؟[56] (اِس طرح) اللہ اِس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو راہ دکھاتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اِس سے گمراہ کرتا ہے تو ایسے[57] سرکشوں[58] ہی کو کرتا ہے جو اللہ کے عہد کو اُس کے باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں[59] اور اللہ نے جس چیز کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، اُسے کاٹتے ہیں،[60] اور اِس طرح زمین پر فساد برپا کرتے ہیں۔[61] یہ وہی ہیں جو (دنیا اور آخرت،

اس کا مذاق نہیں اڑاتے۔

۵۶۔ یعنی یہ کیا مثال ہے؟ کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی میسر ہوئے ہیں؟

۵۷۔ یہ اشارہ ہے یہود کی طرف۔ اس سے آگے ان کے وہ جرائم بیان ہوئے ہیں جن کے باعث وہ توفیقِ ہدایت سے محروم ہوئے۔

۵۸۔ اصل میں لفظ 'فاسق' استعمال ہوا ہے۔ قرآنِ مجید کی اصطلاح میں اس کے معنی معروف سے منکر اور اطاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے ہیں۔

۵۹۔ یہود یہ عہد کس طرح باندھتے اور توڑتے رہے، اس کی تفصیلات آگے سورہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

۶۰۔ اس سے مراد رشتۂ رحم اور رشتۂ قرابت کا کاٹنا ہے۔ قرآن نے یہ اسلوب جہاں بھی اختیار کیا ہے، موقعِ کلام کی دلالت سے واضح ہے کہ رشتۂ رحم و قرابت ہی کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس میں جو ابہام ہے اس سے رشتۂ رحم کی عظمت واضح ہو جاتی ہے۔ گویا یہ ایسی معروف اور بدیہی حقیقت ہے کہ اس کا نام لیے بغیر ہی ہر شخص سمجھ لیتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے خدا نے کاٹنے کا نہیں، بلکہ جوڑنے کا حکم دیا ہے۔

۶۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان توڑنے کے بعد جب یہ دوسرا قدم بھی اٹھا لیتے ہیں تو اس سے زمین میں فساد برپا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ تمدن اور معاشرت میں صلاح و فلاح کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور رشتۂ رحم کی حرمت ہی پر قائم ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ
يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ
ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

دونوں میں) نامراد ہیں۔۲۶-۲۷

(اے[۶۲] لوگو،) تم اللہ کے منکر[۶۳] کس طرح ہوتے ہو، دراں حالیکہ تم مردہ تھے تو اُس نے تمھیں زندگی عطافرمائی، پھر وہی مارتا ہے، اِس کے بعد وہی زندہ کرے گا، پھر اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[۶۴] وہی[۶۵] جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا[۶۶] اور سات آسمان استوار کر دیے، اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔۲۸-۲۹

۶۲۔ یہاں سے پھر وہ دعوت سامنے آگئی ہے جو 'اعبدوا ربکم' سے شروع ہوئی تھی۔

۶۳۔ اصل میں 'کیف تکفرون باللّٰہ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'کفر' سے مراد خدا کا انکار نہیں، بلکہ قیامت کا انکار ہے۔ اس کو خدا کے انکار سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ قیامت کا انکار در حقیقت خدا کی تمام اعلیٰ صفات —— قدرت، ربوبیت، علم اور حکمت —— کا انکار ہے۔ جو شخص ان صفات کے بغیر خدا کو مانتا ہے، اس کا ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔

۶۴۔ یہ معاد اور قیامت کے ممکن ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی جس نے تمھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اس طرح گویا مردہ سے زندہ کیا ہے، وہ مرنے کے بعد دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہ جائے گا؟

۶۵۔ یہاں سے پیرے کے آخر تک اب قیامت کے ضروری ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ یعنی جس طرح پروردگار کی قدرت، ربوبیت اور علم و حکمت کی گواہی یہ آسمان و زمین دے رہے ہیں، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تمھیں پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے اور تمھارے نیک و بد میں کوئی امتیاز نہ کرے؟ لہٰذا قیامت اٹل ہے، وہ ہر حال میں ہو کر رہے گی۔

۶۶۔ اصل الفاظ ہیں: 'ثم استوی الی السماء'۔ ان میں 'استواء' کے معنی سیدھے کھڑے ہونے کے ہیں اور 'الیٰ' کے ساتھ اس کا صلہ دلالت کرتا ہے کہ یہ توجہ کرنے کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یہاں کھڑے ہونے اور توجہ کرنے کا وہی مطلب لینا چاہیے جو اللہ، پروردگارِ عالم کے شایانِ شان ہے۔

[باقی]

طالب محسن

تصور توحید

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۲۰)

عن ابی هریره رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: قال الله تعالیٰ: کذبنی اب آدم و لم یکن له ذلک. فاما تکذیبه ایای. فقوله: لن یعیدنی کما بدءنی ولیس اول الخلق باھون علی من اعادته، و اما شتمه ایای، فقوله: اتخذ الله ولدا، وانا الاحد الصمد، الذی لم الد ولم اولد ولم یکن لی کفرا احد.

لغوی بحث

'کذبنی': مجھے جھٹلایا۔ میری طرف جھوٹ کی نسبت کی۔ یہاں اس سے اللہ تعالیٰ کے وعدے کے باوجود آخرت کا انکار ہے۔

'ابن آدم': انسان کے لیے یہ تعبیر ابوالآبا حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت سے اختیار کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں 'یا بنی آدم' کا اسلوب بھی اسی پہلو سے اختیار کیا گیا ہے۔ اناجیل میں بھی یہ تعبیر ایک خاص تاثر پیدا کرتی ہے۔

'لم یکن له ذلک': یہ 'ما کان ینبغی له' کے معنی میں ہے۔ یعنی درست اور موزوں نہیں ہے۔ یہ جملہ حال واقع ہوا ہے۔

'شتمنی': اس نے مجھے برا کہا۔ اس نے مجھ پر تہمت لگائی۔ یہ ہر اس گفتگو کے لیے آتا ہے جس سے دوسرے کے وقار اور عزت و عصمت کی نفی مقصود ہو۔

'اول الخلق': 'اول' کا لفظ جہت یعنی ظرفیت کے مفہوم میں بھی آتا ہے اور صفت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں پہلے مفہوم میں آیا ہے۔ پوری ترکیب کے معنی ہیں پہلی مرتبہ تخلیق۔ 'ولیس... من اعادته' حال کے محل میں ہے۔

'اھون': 'یھون' سے افعل ہے۔ یہاں زیادہ سہل کے معنی میں ہے۔ لفظی معنی حقیر اور ہلکا ہونے کے ہیں۔ مذکورہ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہ لفظ بہت بلیغ ہے۔

'اتخذ ولدا': بیٹا بنانا۔ 'اتخذ' کا فعل کسی کو کوئی حیثیت دینے کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً 'اتخذہ صدیقا' اس نے اس کو دوست بنایا۔

'الاحد': یکتا، سب سے الگ، ممتاز اور بے نیاز۔ 'واحد' اور 'احد' میں فرق یہ ہے کہ 'واحد' صفات میں یکتا ہونے اور 'احد' ذات میں یکتا ہونے کے معنی کا حامل ہے۔

'الصمد': یہ لفظ اصل میں بڑی چٹان کے لیے آتا ہے، جس کی دشمن کے حملہ کے وقت پناہ پکڑتے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس لفظ کے آنے کا پس منظر واضح کیا ہے:

> ''پناہ کی چٹان سے قوم کے سردار کو جو قوم کا پشت پناہ اور سب کا مرجع ہو 'صمد' کہنے لگے۔ زبور اور دوسرے آسمانی صحائف میں اللہ تعالیٰ کو بکثرت چٹان اور مدد کی چٹان کہا گیا ہے۔'' (تدبرِ قرآن: ج ۹ ص ۶۵۰)

ترجمہ

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ابنِ آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اس کے لیے موزوں نہیں تھا اور ابنِ آدم نے میری بے توقیری کی حالانکہ یہ اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ جہاں تک مجھے جھٹلانے کا تعلق ہے تو یہ اس کا یہ کہنا ہے کہ میں اسے قطعاً نہیں لوٹاؤں گا (یعنی دوبارہ زندہ نہیں کروں گا)۔ جبکہ پہلی مرتبہ تخلیق کرنا دہرانے کے مقابلے میں آسان نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی گالی یہ ہے کہ اللہ نے اولاد بنائی۔ جبکہ میں یکتا و بے نیاز اور سب کا پشت پناہ ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ مجھے کسی نے جنا ہے، اور نہ میرا کوئی ہم پلہ ہی ہے۔''

متون

یہ روایت مختلف طرق میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ مثلاً 'ما کان له ذلک' کے بجائے دوسرے متون میں 'ما ینبغی له' یا 'لم یکن ینبغی له' روایت ہوا ہے۔ 'لن یعیدنی' کی جگہ 'لیس یعیدنی' یا 'لا اعیده کما بداته' آیا ہے۔ اسی طرح 'ولیس اول الخلق باھون علی من اعادته' کے مفہوم کو 'ولیس آخر الخلق باعز علی من اوله' کے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ بہر حال ان متون میں نمایاں ترین فرق یہی ہے کہ بعض روایات میں 'ولیس اول...' اور 'وانا الاحد...' والے توضیحی جملے روایت نہیں ہوئے۔

معنی

بنیادی طور پر اس روایت میں توحید اور معاد سے متعلق قریش اور یہود و نصاریٰ کے افکار پر تنقید کی گئی ہے۔ لیکن یہ تنقید محض تجزیے کی نوعیت کی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غیظ و غضب بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عقائد کی زیرِ بحث غلطیاں محض علمی نوعیت کی نہیں ہیں۔ اس طرح کے عقائد در حقیقت اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے اور اس کی توہین کرنے کے مترادف ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قریش آخرت کو نہیں مانتے تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ لوگ جب مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے تو ان کا دوبارہ اٹھ کھڑا ہونا بعید از امکان ہے۔ اس روایت میں صرف یہی نہیں بتایا گیا کہ یہ استدلال بالکل بودا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اس سے خدا کے وعدے اور اس کی قدرت و حکمت پر عدمِ اعتماد کا اظہار ہوتا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے ساتھ یومِ حساب کے انعقاد کے متعلق کیا تھا۔ اسی طرح نصاریٰ حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ عرب کے یہود عزیر کو اللہ کا بیٹا اور قریش اور دوسرے عرب قبائل فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ اس روایت میں اس عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ رکھنے والے خدا کے بے مثال، بے احتیاج اور سب کے خالق ہونے کے پہلو کو مجروح کرتے ہیں۔ اس طرح وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔

اس طرح یہ روایت خدا کی صفات کی حقیقی معرفت پیدا کرتی اور اس کے بارے میں اختیار کردہ غلط عقائد کی شناعت واضح کرتی ہے۔

قرآن سے تعلق

مضمون کے لحاظ سے یہ روایت قرآنِ مجید کے دو بنیادی موضوعات پر مشتمل ہے۔ قرآنِ مجید کی دعوت شرک کے استیصال اور توحید کے استحکام کی دعوت ہے۔ اسی طرح آخرت کا انذار بھی قرآنِ مجید کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس روایت میں ان کے خلاف کیے گئے استدلال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس روایت میں توحید کی توضیح جن الفاظ میں کی گئی ہے، وہ سرتاسر سورۂ اخلاص میں موجود ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ. اَللّٰهُ الصَّمَدُ. لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ. (۱۱۲: ۱-۴)

”کہہ دو، وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب کا سہارا ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا، نہ اس کو کسی نے جنا۔ اس کا کوئی ہم سر نہیں ہے۔“

اسی طرح قرآنِ مجید نے آخرت کے آنے کا ذکر خدا کے ایک وعدے کی حیثیت سے کیا ہے۔ اہلِ ایمان کے حوالے سے فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ. (المائدہ ۵: ۹)

”اللہ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے، جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے۔“

منافقین اور اہلِ کفر کے حوالے سے ارشاد ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ. (توبہ ۹: ۶۸)

”اللہ نے منافق مردوں اور عورتوں اور اہلِ کفر سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ اس روایت میں آخرت کے انکار کو خدا کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں آخرت کے انکار کو خدا کا انکار بھی قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (البقرہ ۲: ۲۸)

”تم اللہ کا کس طرح انکار کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ تم مردہ تھے تو اس نے تم کو زندہ کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ پھر وہ تمھیں زندہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

گویا وعدے کے پہلو سے دیکھیں تو آخرت کا انکار خدا کی تکذیب ہے اور قدرت کے پہلو سے دیکھیں تو یہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خدا کا انکار ہے۔

اسی طرح خدا کی اولاد کا تصور بھی قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر زیرِ بحث آیا ہے۔ اس روایت میں جو بات 'شتمنی' سے ادا کی گئی ہے، اس کی شدت کا صحیح اندازہ سورۂ مریم کے اس مقام سے ہوتا ہے:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا. لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا. تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا. اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا. وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا. اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا. (مریم ۱۹:۸۸-۹۳)

"اور کہتے ہیں کہ خدائے رحمان نے اولاد بنا رکھی ہے۔ یہ تم نے ایسی سنگین بات کہی ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ پڑیں، زمیں شق ہو جائے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر پڑیں کہ انھوں نے خدا کی طرف اولاد کی نسبت کی اور یہ بات خدا کے شایان شان نہیں کہ وہ اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں، سب خدائے رحمان کے حضور میں بندے ہی کی حیثیت سے حاضر ہوں گے۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

غرض یہ کہ یہ بات خدا کی شان کے منافی ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے لیے اولاد اختیار کرے۔ اولاد انسان کی ضرورت ہے اور انسان کی غلطی یہی ہے کہ وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگتا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں اس روایت کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن ہی کی بات کو دوسرے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

کتابیات

بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ۱، کتاب تفسیر القرآن، باب ۳۹۱، باب ۳۹۲۔ نسائی، کتاب الجنائز، باب ۱۱۷۔ مسند احمد عن ابی ہریرہ۔

طالب محسن

خدا کی اولاد

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۲۱)

عن ابن عباس: واما شتمه ایای فقوله: لی ولد وسبحانی ان اتخذ صاحبة اوولدا.

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لغوی بحث

'سبحانی': میں پاک ہوں۔ یہ 'سبح' سے علم ہے۔ ہمیشہ منصوب ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے اس کے ہر طرح کے عیب اور نقص سے پاک ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اہلِ نحو کے نزدیک اس کے نصب کا باعث اس کا فعلِ محذوف کا مصدر ہونا ہے۔

ترجمہ

''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ .... اس کا مجھے بے توقیر کرنا یہ کہنا ہے کہ میری اولاد ہے۔ حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔''

متون

یہ روایت دو صحابہ سے مروی ہے۔ ایک حضرت ابو ہریرہ اور دوسرے حضرت ابنِ عباس۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت حدیث (حدیث: ۲۰) تفصیل سے زیرِ بحث آچکی ہے۔ حضرت ابنِ عباس کی اس روایت کو

صحاح کے مصنفین میں سے صرف بخاری نے روایت کیا ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے اس روایت کا پورا متن درج نہیں کیا۔ روایت کا متن درج ذیل ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال قال اللّٰہ تعالیٰ: کذبنی ابن آدم ولم یکن لہ ذلک. وشتمنی ابن آدم ولم یکن لہ ذلک. فاما تکذیبہ ایای فزعم انی لا اقدر ان اعیدہ کما کان. واما شتمہ ایای فقولہ لی ولد و سبحانی ان اتخذ صاحبۃ اوولدا.

''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ابنِ آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اس کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس نے میری بے توقیری کی جبکہ یہ اس کے لیے درست نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ کہنا ہے کہ میں اسے جس طرح کہ وہ ہے اسی طرح کا دوبارہ نہیں بنا سکتا۔ اور اس نے میری بے توقیری یہ کہہ کر کی ہے کہ میری اولاد ہے، حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معنی

اس روایت میں پچھلی روایت کے مقابلے میں 'صاحبۃ' یعنی بیوی کا اضافہ ہے۔ اولاد کے تصور کے ساتھ ہی بیوی کا تصور بھی وابستہ ہے۔ اسی مناسبت سے یہاں بیوی کے وجود کی بھی نفی کی گئی ہے۔ دنیا میں بیشتر جان دار جوڑا جوڑا بنائے گئے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوڑے کے دونوں فرد ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ گویا جوڑے کا کوئی فرد اپنی ذات میں مکمل نہیں ہے، وہ اپنی تکمیل کے لیے ساتھی کا محتاج ہے۔ پروردگارِ کائنات اس سے بہت ماورا ہے کہ اسے کسی بھی نوعیت کے ساتھی کی احتیاج ہو۔

قرآن سے تعلق

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد کے تصور پر جہاں غضب کا اظہار کیا ہے وہاں استدلال کر کے اس عقیدے کے باطل ہونے کو بھی واضح کیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

''اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ. بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ.(٦:١٠١-١٠٢)

تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کی اولاد کہاں سے آئی جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔‘‘

اس آیۂ کریمہ میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اس ہستی کے لیے جو زمین و آسمان کی موجد ہے یہ تصور رکھنا کہ اس کی اولاد ہے اپنے اندر کس قدر تضاد رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ حماقت ایک اور حماقت کا پیش خیمہ ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے لیے بیوی کا وجود بھی مانا جائے۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سورۂ انعام کے مخاطب قریش ہیں اور وہ خدا کے لیے کسی بیوی کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے۔

کتابیات

بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب ۱۰۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مناجات

ساجد حمید

کرب و تکلیف کے موقع کی دعا

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَ رَبُّ الْأَرْضِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ.

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

الٰہ صرف اللہ ہے، جو عظیم اور بردبار ہے۔

الٰہ صرف اللہ ہے، جو عرشِ عظیم کا رب ہے۔

الٰہ صرف اللہ ہے، جو آسمانوں کا بھی مالک ہے اور رب ہے اور زمین کا بھی، اور وہ عرشِ کریم کا رب ہے۔

مشکلات اور آسانیاں سب اللہ کی آزمایش ہیں، یہ آدمی کے ایمان اور حق پر ثابت قدمی کے امتحان کے لیے آتی ہیں۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی اس امتحان میں ناکام ہو سکتا ہے اگر وہ اللہ کے طریقوں (سنن) اور صفات سے واقف نہ ہو۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے نہ وہ حق پر ثابت قدم رہ سکتا ہے اور نہ اللہ سے صحیح معنی میں طلب گارِ مدد ہو سکتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکلات کے لیے یہ دعا سکھائی ہے تو اس میں انھی صفات کے حوالے سے دعا مانگی گئی ہے۔ سب سے پہلے جن صفات کا حوالہ ہے وہ عظمت و حلم ہیں۔ عظمت و حلم یہاں ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آدمی چھوٹے مقاصد اور جذبات سے بلند ہو کر معاملہ کرے۔ اور حلم بھی بردباری اور جذبات سے بلندی کا نام ہے۔ اگرچہ ایک اعتبار سے ایک میں حوصلہ مندی کا عنصر غالب ہے اور

دوسرے میں در گزر کرنے کا۔

یہاں ان صفات کے حوالے سے مقصد یہ ہے کہ آدمی مشکلات میں اپنے خدا کے بارے میں نظریات درست رکھے کہ خدا کی ذات ایسی نہیں ہے کہ جذبات میں آکر یا جہالت سے مغلوب ہو کر اپنے بندوں پر کوئی مشکل نازل کر دے۔ وہ ان منفی جذبات سے یکسر پاک ہے۔ وہ عظیم اور حلیم ہے۔ اس اعتبار سے یہ صفات اللہ کے بارے میں ہمارے لیے تسلی کا مضمون لیے ہوئے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ دعا کے جملے ہیں، اس لیے ان میں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ اے اللہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کو جن کی وجہ سے ہمارے اوپر یہ مشکل آئی ہے، انھیں اپنی عظمت و حلم کے واسطے سے معاف کر دے۔

ان صفات سے پہلے اللہ کے واحد الٰہ ہونے کا بیان ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے بھی کسی دعا میں یہ بات کہہ آئے ہیں کہ آدمی اگر اللہ پر اس کی صفات کے صحیح شعور کے ساتھ ایمان نہ رکھتا ہو تو وہ مشکلات میں اپنے حقیقی الٰہ کو چھوڑ کر دوسرے انسانوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگ جاتا ہے۔ اس لیے مشکل کے وقت پر پہلے ہی مرحلے میں جس چیز کی یاد دہانی ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، جس کے دروازے پر فریاد لے کر وہ جا سکتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کا آغاز انھی الفاظ سے کیا ہے۔ اگر مشکلات کے پہلو سے دیکھیں تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مشکلات بھی اسی کی مرضی سے آتی ہیں۔ کسی کا یارا نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو مشکل میں ڈال دے۔ خواہ یہ مشکلات ہماری کرتوتوں کا نتیجہ ہوں یا آزمایشوں کا۔ اس لیے ہر فریاد کی دادرسی اور ہر غم کا مداوا اگر کسی دروازے سے ہونا ہے تو وہ یہی ہے۔

دوسرے جملے میں 'رب العرش العظیم' کی صفت کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "وہ عظیم اقتدار کا مالک ہے"۔ اقتدار کی عظمت خود قرآنِ مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ 'وسع کرسیه السموات الارض' (آیت الکرسی) اس کا اقتدار اور بادشاہی زمین و آسمان پر پھیلی ہوئی ہے۔ اور دوسرے موقع پر یہ بھی بیان ہوا ہے کہ کوئی پتا بھی اس کے علم کے بغیر نہیں گر سکتا۔

یعنی اس کا اقتدار پوری کائنات پر محیط ہے۔ کوئی مشکل اس کے حکم کے بغیر نہ کسی کے گھر اتر سکتی ہے اور نہ اسے پریشان کر سکتی ہے۔ اور کوئی کسی اور کے دروازے سے کیسی ہی دادرسی پالے، اور کیسی ہی توقعات اس سے وابستہ کر لے، اگر اللہ کا حکم نہ ہو تو وہ مشکل حل نہیں ہو سکتی۔

تیسرے جملے میں اس اقتدار کی وسعت کو 'رب السموات و الارض' کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ یہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اقتدار ربوبیت کی نوعیت کا ہے۔ ربوبیت میں پرورش اور نگہداشت کا مفہوم بھی موجود ہے۔ کرب و تکلیف کے موقع پر اس صفت کا حوالہ دے کر نگہداری کے تقاضے کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اللہ ہماری نگہداری کرے اور تکلیف دور فرمائے اور اس طرح زمین و آسمان کی بادشاہی سے مراد یہ ہے کہ اس کا اقتدار ہر شے پر ہے اس لیے وہ ہر طرح سے ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس لیے خدا کے حوالے سے اس جملے سے امید پیدا ہوتی ہے۔

'رب العرش الکریم' میں اس اقتدار کی فیض رسانی کا حوالہ ہے۔ اس حوالے سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی فیض رسانی ہمیں اس مشکل سے نکالنے کے لیے حرکت میں آئے اور ہمیں اس کرب سے نجات دے گویا 'رب السموات و الارض' سے مراد یہ ہوا کہ ہم پر جتنی مشکلیں آتی ہیں ان کے مقابلے میں اس کا اقتدار ایسا نہیں ہے کہ اس کی رعایا مشکلوں میں پڑی رہے اور بھوکوں مرتی رہے اور اس صاحبِ اقتدار کے پاس ان کا کوئی حل موجود نہ ہو اور رب العرش الکریم سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک کریم ذات کی بادشاہی ہے۔ جس کی فیض رسانی عام و خاص کے لیے جاری ہے اور جو عالمین کا فیض رساں رب ہے۔ یہ جملے بھی تسلی کے مضمون کے حامل ہیں اور ایک ایسی تسلی اپنے اندر رکھتے ہیں کہ کرب و تکلیف کا احساس اس دعا کے اختتام کے ساتھ ہی دل میں جا گزیں ہو جاتا ہے۔

غصے کے موقع پر دعا

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ.

میں شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔

یہ دعا ہم برے خوابوں کے حوالے سے پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے اس کے معنی پر ہم یہاں بات نہیں کریں گے۔ صرف اس موقع کی مناسبت سے ہم دیکھیں گے کہ اس موقع کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو گالیوں کے جواب میں گالیاں دیتے سنا تو فرمایا کہ اگر یہ کلمات کہتا تو اس کا یہ غصہ رفع ہو جاتا جس کی وجہ سے وہ گالیاں دے رہا ہے۔

غصہ حق کی حمایت اور غیرت میں بھی ہو تو وہ بھی اگر اخلاق، شریعت اور قانون کی حد سے تجاوز کر جائے تو ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اگر غصہ بندۂ مومن کے خلاف ہو اور اس سطح تک چلا جائے کہ وہ اسے گالیاں دینے لگے تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ فسق ہے، جس کا آدمی نے ارتکاب کر لیا۔ قرآنِ مجید نے دوسروں کے برے نام رکھنے سے روکا ہے۔ گالی اس کی بدترین شکل ہے۔

ظاہر ہے اللہ کی نافرمانی فسق ہے۔ ایسا عمل شیطان کی اکساہٹ ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے جب آدمی کا غصہ اس سطح تک پہنچ جائے تو پھر اسے شیطان کے اثر سے باہر آنے کے لیے اللہ کی مدد مانگنی چاہیے جو یہاں اس دعا میں مانگی گئی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

اصول و مبادی

(۱۱)

مبادیِ تدبرِ قرآن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متشابہاً مثانی

پانچویں چیز یہ ہے کہ قرآن اپنا مدعا اتنی مختلف صورتوں اور گوناگوں پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں وہ خود اپنے اجمال کی تفصیل اور اپنے معجزانہ کلام کی ایسی شرح و تفسیر بن گیا ہے کہ دنیا کی دوسری کتابوں میں اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اسی بنا پر اس نے اپنی تعریف 'کتاباً متشابھاً' کے الفاظ سے کی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ. (الزمر ۳۹: ۲۳)

''اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیتیں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی اور سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔''

'ولقد صرفنا فی هذا القرآن لیذکروا'[۲۸] اور اس مضمون کی دوسری آیات میں یہی حقیقت قرآن نے لفظ 'تصریف' سے واضح کی ہے۔ اس کے معنی گردش دینے کے ہیں، یعنی ایک ہی بات کو مختلف

۲۸۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۴۱۔

طریقوں اور بوقلموں اسلوبوں سے پیش کرنا۔اسی طرح فرمایا ہے:

كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ.(ہود ۱۱:۱)

''یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم اتاری گئیں، پھر حکیم و خبیر خداوندِ عالم کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔''

یعنی پہلے اعجاز، جامعیت اور اختصار کا طریقہ اختیار کیا گیا، پھر انھی گٹھے ہوئے، جامع اور مختصر گویا دریا بہ کوزہ جملوں کی تفصیل کر دی گئی۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی قرآن کے اس وصف کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ قرآن کی تلاوت کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ایک مضمون مختلف سورتوں میں بار بار سامنے آتا ہے۔ ایک مبتدی یہ دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ہی مضمون کی تکرار ہے، لیکن قرآن پر تدبر کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآن تکرارِ محض سے بالکل پاک ہے۔ اس میں ایک بات جو بار بار آتی ہے تو بعینہٖ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں آتی، بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مقام کی مناسبت سے اس میں مناسبِ حال تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ایک مقام میں ایک پہلو مخفی ہوتا ہے، دوسرے مقام میں وہ واضح ہو جاتا ہے، ایک جگہ اس کا اصل رخ غیر معین ہوتا ہے، دوسرے سیاق وسباق میں وہ رخ بالکل معین ہو جاتا ہے، بلکہ میرا ذاتی تجربہ اور مدتوں کا تجربہ تو یہ ہے کہ ایک ہی لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے، دوسری آیت میں وہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی، لیکن دوسری جگہ وہ بالکل آفتاب کی طرح روشن نظر آتی ہے۔

قرآن کا یہ اسلوب، ظاہر ہے کہ اسی مقصد کے لیے ہے کہ اس کی ہر بات طالب کے ذہن نشین ہو جائے۔ چنانچہ، میں بطور تحدیثِ نعمت کے عرض کرتا ہوں کہ مجھ پر قرآن کی مشکلات جتنی خود قرآن سے واضح ہوئی ہیں، دوسری کسی بھی چیز سے واضح نہیں ہوئی ہیں۔ میر انیس نے کہا ہے کہ:

اک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

ممکن ہے خود ان کے لیے اپنے کلام کے بارے میں یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی ہو، لیکن قرآن کے باب میں یہ بات بالکل حق ہے۔ ایک ایک بات اتنے گوناگوں و بوقلموں اسلوبوں سے سامنے آتی ہے کہ اگر آدمی ذہنِ سلیم رکھتا ہو تو اس کو پکڑ ہی لیتا ہے۔''(تدبرِ قرآن، ج ۱، ص ۲۸)

یہ دورِ حاضر میں امام حمید الدین فراہی کے بعد قرآن کے سب سے بڑے عارف کا بیان اور زندگی بھر کا تجربہ ہے۔ قرآن کا جو طالب علم بھی تدبر کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے گا، اس حقیقت کو اس کے ورق ورق پر ثبت پائے گا۔ چنانچہ یہ بات اس روشنی میں بطورِ اصول ماننی چاہیے کہ 'القرآن یفسر بعضه بعضاً' (قرآن آپ اپنی تفسیر کرتا ہے)۔ یہ بات صرف قرآن کی تعلیمات، اس کے تاریخی اشارات اور اس کی تلمیحات ہی کے حد تک صحیح نہیں ہے، بلکہ قرآن کا یہ عجیب معجزہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ و اسالیب کی مشکلات کے حل کے لیے بھی اپنے اندر نظائر و شواہد کا ایک قیمتی ذخیرہ رکھتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"یہاں تفصیل میں پڑنے کی گنجایش نہیں ہے، ورنہ ہم دکھاتے کہ کس طرح قرآنِ مجید عام بول چال کے اندر سے ایک معمولی لفظ اٹھالیتا ہے اور اس کے معروف معنی سے کہیں زیادہ بلند معنی میں استعمال کرتا ہے اور پھر اپنے طریق استعمال کے تنوع سے اس کے لیے ایسا مخصوص ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ "لسان العرب" اور "صحاح جوہری" کی رہنمائی کے بغیر قرآن کا ایک طالب علم اس لفظ کے پورے مالہ وماعلیہ کو اس طرح سمجھ لیتا ہے کہ کوئی چیز بھی اس کے یقین کو جھٹلا نہیں سکتی۔

مفرد الفاظ کے علاوہ اسالیبِ کلام اور نحوی تالیف کے باب میں بھی قرآنِ مجید کا یہی حال ہے۔ اربابِ نحو قرآنِ مجید کی جن ترکیبوں میں نہایت الجھے ہیں اور کسی طرح ان کو نہیں سلجھا سکے ہیں، خود قرآنِ مجید میں ان کی مثالیں ڈھونڈیے تو ایک سے زیادہ مل جائیں گی اور پیش و عقب کے ایسے دلائل و قرائن کے ساتھ مل جائیں گی کہ ان کے بارے میں ہمارے اطمینان کو کوئی چیز مجروح نہیں کر سکتی۔" (مبادیِ تدبرِ قرآن، ص ۶۰-۶۱)

(باقی)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ دعوت

(نئی اشاعت کے لیے مصنف کی طرف
سے نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد)

(۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں حق کو اختیار کریں وہ اسے اختیار کر لینے کے بعد دوسروں کو بھی برابر اس کی تلقین و نصیحت کرتے رہیں۔ دین کا یہی مطالبہ ہے جس کے لیے بالعموم دعوت و تبلیغ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ہم مسلمان اس حقیقت سے ہمیشہ واقف رہے کہ ایمان و عملِ صالح کی جو روشنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کی ہے، اس کا یہ حق ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم دوسروں کو بھی اس سے محروم نہ رہنے دیں۔ اس کام کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے جہاں عبادات، سیاست، معیشت اور بعض دوسرے معاملات میں اپنی شریعت انسانوں کو دی ہے وہاں اس دعوت کے لیے بھی ایک مفصل قانون اس شریعت میں واضح فرمایا ہے۔ اس قانون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا کہ اس میں دعوت کی ذمہ داری اہلِ ایمان کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے بالکل الگ الگ صورتوں میں ان پر عائد کی گئی ہے۔ تفہیمِ مدعا کے لیے ہم اس قانون کو ان چھ عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

فرد کی نصیحت

ریاست کی دعوت

علما کا انذار

پیغمبر کا انذار

صحابہ کی شہادت

دعوت کا طریق کار

ذیل میں ہم انھی عنوانات کے تحت اس باب میں قرآنِ مجید کے نصوص کی وضاحت کریں گے۔

۱۔ فرد کی نصیحت

وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ.(العصر ۱۰۳: ۱-۳)

”زمانہ گواہی دیتا ہے کہ یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں گے۔ ہاں مگر وہ نہیں جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی۔“

ان آیتوں میں 'تواصوا بالحق' اور 'تواصوا بالصبر' کی جو تعبیر اللہ تعالیٰ نے دعوت کی ذمہ داری کو بیان کرنے کے لیے اختیار فرمائی ہے اور جس سیاق میں اسے لایا گیا ہے، اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہم عارف ہوں یا عامی، ہمارا اقیام کسی بستی میں ہو یا جنگل میں، ہم غیر مسلموں کے ملک میں رہتے ہوں یا مسلمانوں کی کسی منظم ریاست کے شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہوں، ہر حال میں اس کے مکلف ہیں۔ یہ ہر فرد کی ذمہ داری اور ایمان کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک ہے۔ بندۂ مومن نیک عمل کرے اور ایمان کا یہ تقاضا بھی پورا کر دے تو قرآن نے اس مقام پر اسے ضمانت دی ہے کہ دنیا اور آخرت میں خدا کے عذاب سے محفوظ رہے گا اور جنت کی ابدی بادشاہی اسے حاصل ہو جائے گی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس کام کی جو نوعیت ان آیتوں میں بیان ہوئی ہے، اس سے یہ بھی واضح ہے کہ دعوت کی اس صورت میں داعی اور مدعو الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص ہر وقت جس طرح داعی ہے، اسی طرح مدعو بھی ہے۔ قرآنِ مجید نے اس کے لیے 'تواصوا' یعنی ایک دوسرے کو نصیحت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ فرض باپ کو بیٹے کے لیے اور بیٹے کو باپ کے لیے، بیوی کو شوہر کے لیے اور شوہر کو بیوی کے لیے، بھائی کو بہن کے لیے اور بہن کو بھائی کے لیے، دوست کو دوست کے لیے اور پڑوسی کو پڑوسی کے لیے، غرض یہ کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ متعلق ہر شخص کے لیے ادا کرنا چاہیے۔ وہ جہاں یہ دیکھے کہ اس کے متعلقین میں سے کسی نے کوئی خلافِ حق طریقہ اختیار کیا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے علم اور اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق اسے راستی کی روش اپنانے کی

نصیحت کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ صبح ہم کسی شخص کو کوئی حق پہنچائیں اور شام کے وقت وہ ہمارے لیے یہ خدمت انجام دے۔ آج ہم کسی کو کوئی نصیحت کریں اور کل وہ ہمیں کسی حق کی تلقین کرے۔ غرض یہ کہ جب موقع میسر آئے، ہر مسلمان کو اپنے دائرۂ عمل میں یہ کام لازماً انجام دیتے رہنا چاہیے۔

ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی یہی نصیحت ہے جسے قرآنِ مجید نے بعض دوسرے مقامات پر 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی عقل وفطرت کی رو سے جو باتیں اچھی ہیں، ان کی تلقین کی جائے اور جو بری ہیں، ان سے لوگوں کو روکا جائے۔ یہ در حقیقت منفی اور مثبت، دونوں پہلوؤں سے 'تواصی بالحق' ہی کا بیان ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (التوبہ ۹: ۷۱)

”اور مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ باہم دگر بھلائی کی نصیحت کرتے اور برائی سے روکتے ہیں۔“

اس دعوت کا اصل دائرۂ عمل، جس طرح ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کے الفاظ سے واضح ہے، ہر شخص کا اپنا ماحول ہے۔ اس کو یہ کام اپنے گھر، اپنے اعزہ واقارب اور اپنے احباب ہی میں کرنا چاہیے۔ وہ جس خاندان میں رہتا، جس ماحول میں زندگی بسر کرتا، جن لوگوں میں کام کرتا اور اپنی مختلف ذمہ داریوں اور مشاغل کے لحاظ سے جن لوگوں سے متعلق ہوتا ہے، حق اور حق پر ثابت قدمی کی یہ نصیحت بھی اس پر اصلاً انھی کا حق ہے جو اگر ادا ہو گا تو لا محالہ انھی کو ادا کرنے سے ادا ہو گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے یہ اصل حق دار تو محروم رہیں اور وہ روم و ایران اور مصر وشام میں جا کر یہ دولت ان لوگوں کو بانٹنا شروع کر دے جن کا کوئی حق اللہ اور اس کے پیغمبر نے اس معاملے میں سرے سے اس پر قائم ہی نہیں کیا۔

پھر اس دائرے میں یہ بھی ضروری ہے کہ الاقرب فالاقرب ہی کی ترجیح قائم رکھی جائے اور آدمی سب سے بڑھ کر اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے بچانے کی کوشش کرے۔ اسے متنبہ رہنا چاہیے کہ وہ اگر دوسروں کے دروازے پر دستک دیتا رہا اور اس کے اپنے گھر والے شب وروز جہنم کے لیے ایندھن فراہم کرتے رہے تو ہو سکتا ہے کہ ساری جدوجہد کے باوجود اس کی یہی کوتاہی دنیا اور آخرت میں اس کے لیے وبال بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

”ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَاَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ عَلَيۡهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمۡ وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ.(التحریم ۶۶:۶)

اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن یہ لوگ اور ان کے وہ پتھر ہوں گے (جنھیں یہ پوجتے ہیں)۔ اس پر تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا، اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہ کریں گے اور وہی کریں گے جس کا انھیں حکم ملے گا۔''

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اس دائرۂ عمل میں ہر شخص کا ایک دائرۂ اختیار بھی ہے۔ دنیا میں اللہ کا قانون یہی ہے کہ سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد آدمی کسی عورت کا شوہر اور اس کے نتیجے میں بچوں کا باپ بنے۔ بنی آدم کی یہ دونوں حیثیتیں دین و فطرت کی رو سے ان کا ایک دائرۂ اختیار پیدا کرتی ہیں۔ شوہر کی حیثیت سے بیوی اور باپ کی حیثیت سے بچوں پر یہی اختیار ہے جس کی بنا پر ہر شخص مکلف ہے کہ وہ اپنے اس دائرۂ اختیار میں رہنے والوں کے تمام معاملات کے لیے مسئول قرار پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الا، کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیته.(مسلم، کتاب الامارہ)

''آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنایا گیا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

لہٰذا اسی 'تواصوا بالحق' کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اگر کوئی منکر دیکھیں تو اپنے دائرۂ اختیار میں اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کا ارشاد ہے:

من رای منکم منکرا فلیغیره بیده فان لم یستطع فبلسانه، فان لم یستطع فبقلبه، وذلک اضعف الإیمان.(مسلم، کتاب الایمان)

''تم میں سے کوئی شخص (اپنے دائرۂ اختیار میں) کوئی برائی دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔''

'ان لم یستطع' کے الفاظ اس روایت میں اس استطاعت کے لیے استعمال نہیں ہوئے جو آدمی کو کسی چیز کا مکلف ٹھیراتی ہے، بلکہ ہمت اور حوصلے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جو ایمان کی قوت اور کمزوری سے کم

یا زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا ہر شخص کے دائرۂ اختیار میں اس کا پہلا کام یہی ہے کہ خود دین ہی کی کوئی مصلحت مانع نہ ہو تو قوت سے منکر کو مٹا دے۔ زبان سے روکنے کا درجہ اس دائرے میں دوسرا ہے اور دل کی نفرت وہ آخری درجہ ہے کہ آدمی اگر اس پر بھی قائم نہ رہا تو اس کے معنی پھر یہی ہیں کہ ایمان کا کوئی ذرہ بھی اس میں باقی نہیں رہ گیا ہے۔

قرآن کی تصریحات، دین کے مسلمات، رسولوں کی سیرت اور روایت کے اپنے الفاظ کی روشنی میں اس کی صحیح تاویل یہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ شوہر، باپ، حکمران سب اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں لاریب، اسی کے مکلف ہیں کہ منکر کو قوت سے مٹادیں۔ اس سے کم جو صورت بھی وہ اختیار کریں گے، بے شک ضعفِ ایمان کی علامت ہے، لیکن اس دائرے سے باہر اس طرح کا اقدام کوئی جہاد نہیں، بلکہ بدترین فساد ہے جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجایش ثابت نہیں کی جاسکتی۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ داعی کی حیثیت سے خدا کے کسی پیغمبر کو بھی تذکیر اور بلاغِ مبین سے آگے کسی اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ. لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ. (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

”تم نصیحت کرنے والے ہو، تم ان پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔ ریاست کی دعوت

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (آلِ عمران ۳: ۱۰۴)

”اور تمھارے اندر سے ایک جماعت اس کام پر مقرر ہونی چاہیے کہ نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے، اور (جو لوگ یہ اہتمام کریں گے) وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

یہ حکم اربابِ اقتدار سے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی خود مختاری حاصل ہو جائے تو اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، برائی سے روکے اور بھلائی کی تلقین کرے۔ دوسرے لفظوں میں گویا قرآن کا منشا یہ ہے کہ فوج اور پولیس کی طرح اسلامی ریاست کے نظام میں ایک محکمہ قانونی اختیارات کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بھی قائم ہونا چاہیے جو اپنے لیے مقرر کردہ حدود کے مطابق اس کام کو انجام دینے کے لیے ہمہ وقت

سر گرمِ عمل رہے۔

مسلمانوں کو یہ حکم اس وقت دیا گیا، جب ان کی ایک باقاعدہ حکومت مدینہ میں قائم ہو گئی، لہٰذا حدود، قتال اور اس طرح کے دوسرے احکام سے متعلق آیات کی طرح اس میں بھی اتنی بات مقدر ہے کہ یہ جماعت حکومت کی طرف سے مقرر ہونی چاہیے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ مجید کی رو سے امت میں قیامِ حکومت کے بعد یہ فرض اس کے اربابِ حل و عقد پر عائد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دین سے پوری طرح وابستہ رکھنے کے لیے وہ انھیں خیر کی طرف بلاتے، منکر سے روکتے اور معروف کی تلقین کرتے رہیں۔ ان پر لازم ہے کہ نظمِ ریاست سے متعلق دوسری تمام فطری ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ اپنی یہ ذمہ داری بھی لازماً پوری کریں:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ.(الحج ۲۲:۴۱)

”(اور یہ اہلِ ایمان وہ لوگ ہیں کہ) اگر ہم ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، بھلائی کی تلقین کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔“

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معز امجد

التزامِ جماعت ـــــ اعتراضات کا جائزہ

(۴)

۵۔اطاعتِ امیر والی روایات کی توجیہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مولانا گوہر رحمٰن صاحب نے پانچویں بات یہ فرمائی ہے کہ وہ روایات جن میں اطاعتِ امیر کو لازم ٹھہرایا گیا ہے، ان میں اصل میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ:

۱۔امیر کے خلاف مسلح بغاوت نہ کی جائے، بلکہ دوسرے طریقوں سے اس کی اصلاح یا تبدیلی کی کوشش کی جائے۔

۲۔یہ حکم صرف ایسی ہی حکومتوں کے بارے میں ہے، جو ملک کا نظام عملاً قرآن وسنت کے مطابق چلا رہی ہوں۔

۳۔ان روایات کا تعلق ذاتی اور شخصی معاملات میں ظلم سے ہے۔ گویا اس سے مراد یہ ہے کہ جب ملک میں شریعت نافذ کرنے والا حکمران تم پر ذاتی طور پر ظلم بھی کر رہا ہو، تو تم اس ظلم پر صبر کرو اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔

مولانا محترم لکھتے ہیں:

> ”...جب حکمران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں کام کرتا ہے تو اس کی اطاعت منوب عنہ کی اطاعت ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ لیکن جب حکمران قرآن وسنت کی بالادستی تسلیم نہیں کرتا اور شریعتِ محمدی سے آزاد ہو کر حکومت کر رہا ہے

تو اس کی اطاعت آخر کس بنیاد پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سمجھی جائے گی۔ یہ درست ہے کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ امیر تمھیں پسند ہو یا ناپسند، اس کا حکم تمھاری رائے یا طبیعت و مزاج کے مطاِق ہو یا نہ ہو، وہ اگر تم پر دوسروں کو ترجیح دے رہا ہو یا تمھارے حقوق ادا نہ کر رہا ہو، جیسی بھی صورتِ حال ہو، تم اس کی اطاعت کرو اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ لیکن ایک تو ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلح بغاوت نہ کرو بلکہ دوسرے ذرائع سے ایسے امیر کی اصلاح یا اس کو بدلنے کی کوشش کرو۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ احادیث اس حکومت کے بارے میں ہیں جو ملک کا نظام، شریعت کے مطابق چلا رہی ہو اور اس کی ریاست میں قرآن وسنت کی بالادستی عملاً تسلیم کی جاتی ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس مضمون کی احادیث کا تعلق ذاتی اور شخصی حقوق سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر حکمران تم پر ذاتی طور پر ظلم بھی کر رہا ہو مگر جب ملک میں شریعت نافذ ہے تو تم صبر کرو اور اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آخر ان احادیث کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت سے باغی اور منحرف سیکولر حکومت بھی "الجماعة" ہے اور اس جماعت کا التزام تقاضائے شریعت ہے؟"

(ماہنامہ "فاران" جون ۱۹۹۵، ص ۲۸)

اس ضمن میں ہم مولانا محترم سے سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ انھوں نے ان روایتوں کے حوالے سے جو تین باتیں بیان فرمائی ہیں، وہ اس موضوع کی روایتوں میں کہاں اور کن الفاظ میں بیان ہوئی ہیں۔ روایت کے الفاظ اگر یہ ہیں کہ ہر حال میں اپنے امیر کی اطاعت کرو، تو اس کے معنی آخر یہ کیسے ہو سکتے ہیں کہ "اس کے خلاف بغاوت نہ کرو، بلکہ اس کی اصلاح کرنے اور اسے بدلنے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرو"؟ یہ معنی زبان و بیان کے کس اصول پر مبنی ہیں؟ آخر کس لغت میں "اطاعت" کے معنی: "بغاوت نہ کرنے اور دوسرے طریقوں کو بروے کار لاتے ہوئے اصلاح اور تبدیل کرنے" کے بیان ہوئے ہیں؟ مولانا محترم اگر برا نہ مانیں تو قرآنِ مجید میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا جو حکم آیا ہے، ذرا اسی اصول پر اس کی شرح و وضاحت بھی فرمادیں۔

اس ضمن میں دوسری بات مولانا محترم نے یہ فرمائی ہے کہ یہ حکم صرف ایسی ہی حکومتوں کے بارے میں ہے، جو ملک کا نظام عملاً قرآن وسنت کے مطابق چلا رہی ہوں۔

اپنے مضمون کے پہلے حصے میں ہم نے اس مضمون کی ساری اہم روایات جمع کر دی ہیں۔ ان روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب اور متنوع مثالیں دے کر یہ بات فرمائی ہے کہ تم لوگ ہر حال میں اپنے

حکمرانوں کی اطاعت پر قائم رہنا، کیونکہ امیر کی اطاعت کو چھوڑنا ''الجماعۃ'' سے نکلنے کے مترادف ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حکمران نماز کے اوقات کے معاملے میں تساہل برتیں گے، ایک اور روایت میں آپ نے فرمایا کہ فاجر حکمران خدا کی نافرمانی کے ساتھ حکومت کریں گے، ایک روایت میں آپ کا ارشاد ہے کہ حکمران تم پر ظلم کریں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نمازوں کے اوقات میں تساہل، اللہ کے احکام کی نافرمانی (فجور) اور ظلم کی موجودگی میں آخر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ایسی حکومتوں کے بارے میں ہے، ''جو ملک کا نظام عملاً قرآن و سنت کے مطابق چلا رہی ہوں''؟ جو حکمران نمازوں کے اوقات کے بارے میں متساہل ہوں، جو اللہ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہوں اور جو اپنی رعایا پر ظلم کرتے ہوں، ان کے بارے میں آخر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ملک کا نظام قرآن و سنت کی عملاً پابندی کر رہا ہے؟ اگر یہ سب کچھ قرآن و سنت سے انحراف نہیں ہے، تو پھر قرآن و سنت سے انحراف آخر کہا کس چیز کو جاتا ہے؟

اس ضمن میں تیسری بات مولانا محترم نے یہ فرمائی ہے کہ ان روایتوں کا تعلق ذاتی اور شخصی معاملات میں ظلم سے ہے۔ گویا اس سے مراد یہ ہے کہ جب ملک میں شریعت نافذ کرنے والا حکمران تم پر ذاتی طور پر ظلم بھی کر رہا ہو، تو تم اس ظلم پر صبر کرو، اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان نہ پہنچاؤ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ان روایتوں میں اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس کی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکے کہ ان کا تعلق محض ذاتی اور شخصی معاملات میں ظلم کرنے سے ہے، تاہم ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان روایتوں میں جس ظلم کا ذکر ہوا ہے، وہ کسی ذاتی یا شخصی معاملے ہی سے متعلق ہے۔ مگر اس صورت میں بھی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شخصی اور ذاتی معاملات میں ظلم کرنا، مولانا کے نزدیک شریعتِ اسلامی کی کھلی خلاف ورزی نہیں ہے؟ کیا یہ قرآنِ مجید کی صریح نصوص سے انحراف نہیں ہے؟ کیا یہ ارشاداتِ نبوی سے بغاوت نہیں ہے؟

مولانا محترم سے ہماری درخواست ہے کہ وہ ہمیں اس بات سے ضرور آگاہ فرمائیں کہ اگر کسی بھی صورت میں حکمران کے خلاف بغاوت یا اس کی اطاعت سے انکار، دین میں لازم ہے تو اس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں فرمایا۔ آپ سے مروی احادیث میں یہ بات تو ہمیں گوناگوں اسالیب میں ملتی ہے کہ ہر حال میں حکمران کی اطاعت پر قائم رہنا، یہ بات بھی ملتی ہے کہ صرف کفرِ بواح ہی کی صورت میں تم اس کی اطاعت کا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

انکار کر سکتے ہو، مگر آخر یہ بات کیوں نہیں ملتی کہ فلاں فلاں صورت میں تم اپنے حکمرانوں کی اطاعت سے لازماً الگ ہو جانا؟ مولانا محترم تو حدیث کے استاذ ہیں، وہ تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کون کون سی صورتوں میں حکمران کی اطاعت سے کنارہ کش ہو جانے کو مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہے۔ ہماری مولانا محترم سے درخواست ہے کہ وہ ہمیں بھی دو چار ایسی روایات کا پتا دیں، جن میں آپ نے یہ حکم فرمایا ہے۔ لیکن اگر ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے، تو پھر ہم اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ اگر ہمارا نقطۂ نظر غلط بھی ہوا تب بھی آخرت کے روز، جب اللہ ہم سے پوچھے گا کہ تم اسلام سے عملاً منحرف اس حکومت کی اطاعت پر کیوں قائم رہے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ تیری کتاب اور تیرے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ہمیں ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جو ہمیں اس بات کی ترغیب بھی دیتی ہو کہ ہم ایسے حکمران کی اطاعت کو چھوڑ دیں۔ ہم مولانا محترم سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ اگر ''بفرضِ محال'' ہماری بات صحیح ہوئی، اور روزِ آخرت آپ سے یہ پوچھ لیا گیا کہ آپ لوگوں کو اسلام سے عملاً منحرف حکمرانوں کی اطاعت کو چھوڑ دینے کا درس کیوں دیتے رہے، اور ایک ایسے اقدام کو لازم کیوں قرار دیتے رہے، جسے ہم نے لازم نہیں ٹھیرایا تھا، تو مولانا محترم اس کا کیا جواب دیں گے؟

۶۔ حضرت حذیفہ والی روایت کی توجیہ

مولانا محترم نے چھٹی بات یہ فرمائی ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کے معنی یہ ہیں کہ جب مسلمان تفرقے کا شکار ہو جائیں، بدعت و ضلالت کا غلبہ ہو جائے تو تم ایسی ہر جماعت سے الگ رہنا جو اسلام کے نام پر بدعت و گمراہی کی دعوت دے رہی ہو اور مسلمانوں کی اس جماعت کے ساتھ جڑ کر رہنا جس کا امیر قرآن و سنت کا التزام کرتا ہو۔ لیکن اگر ایسی صورتِ حال سامنے آجائے کہ مسلمانوں کا اجتماعی نظم درہم برہم ہو گیا ہو، قرآن و سنت کی عملاً پابندی کرنے والی کوئی حکومت موجود نہ ہو اور نہ قرآن و سنت کی بالادستی قبول کرنے والی کوئی ایسی جماعت موجود ہو جو اسلامی نظام کے دوبارہ قیام کی جدوجہد کر رہی ہو اور تم اپنے اندر حالات کا مقابلہ کرنے اور دین کی ''اقامت'' کی غرض سے کوئی جماعت بنانے کی قوت بھی نہ پاتے ہو، تو اپنے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے تمام لوگوں سے الگ ہو کر زندگی گزار دینا۔

مولانا گوہر رحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہمارے لیے اس حدیث میں جو ہدایت ہے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بدعت و ضلالت کے غلبہ کا دور آجائے اور ہر فرقہ، گروہ اور جماعت لوگوں کو اپنی طرف بلائے تو تم ان ائمہ بدعت و

ضلالت میں سے کسی کی دعوت قبول نہ کرو اس لیے کہ یہ اسلام کے نام پر ضلالت کی دعوت ہو گی بلکہ مسلمانوں کی اس جماعت کے ساتھ لگے رہو اور چمٹے رہو جو قرآن و سنت کا التزام کرنے والے امیر کی امارت پر مجتمع ہوں چاہے وہ صالحیت اور صلاحیت کے اعتبار سے اپنے وقت کا معیاری مسلمان ہو یا اس کے اندر کچھ خرابیاں بھی موجود ہوں۔ مگر جب تک اس حکمران نے طاغوت کی شکل اختیار نہ کی ہو اور قرآن و سنت سے منحرف نہ ہوا ہو، اس وقت تک اسی کا التزام کرنا دین کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر تم ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو گئے ہو کہ مسلمانوں کا اجتماعی نظام درہم برہم ہو گیا ہو اور قرآن و سنت کی بالادستی قبول کرنے والی کوئی حکومت موجود نہ ہو اور اس نظام کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والی ایسی دینی جماعت بھی موجود نہ ہو جو قرآن و سنت کا التزام کرتی ہو اور تم اپنے اندر تنہا حالات کا مقابلہ کرنے یا جماعت بنانے کی قوت بھی نہ پاتے ہو بلکہ تمھارے اپنے دین و ایمان کو خطرہ در پیش ہو، تو ایسے حالات میں اپنے ایمان کے بے بہا خزانے کے تحفظ کے لیے لوگوں سے الگ ہو کر کسی محفوظ جگہ میں بیٹھ کر زندگی کے باقی دن پورے کرنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ دوسری حدیث میں اپنے دین کو بچانے کے لیے 'فرار من الفتن' کی رخصت ہی نہیں بلکہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔'' (ماہنامہ ''فاران''، جون ۱۹۹۵، ص ۳۳)

مولانا محترم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والی روایت کی جو شرح فرمائی ہے۔ اس پر کوئی بات کرنے سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ روایت کے عربی متن کا ترجمہ خود مولانا ہی کے الفاظ میں پیش کر دیں۔ مولانا اس روایت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور میں شر کے بارے میں زیادہ سوال کیا کرتا تھا۔ اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں یہ شر مجھ پر نہ آ جائے۔ چنانچہ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ہم لوگ جاہلیت اور شر کی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ یہ خیر ہمارے پاس لے آئے (ایمان و اسلام اور امن و امان) تو کیا اس خیر کے بعد شر دوبارہ آئے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں، آئے گا۔ میں نے کہا: اس شر کے بعد دوبارہ خیر آئے گا؟ فرمایا: ہاں آئے گا، مگر اس میں گدلا پن ہو گا۔ میں نے پوچھا: یہ گدلا پن کیسا ہو گا؟ فرمایا: ایسے لوگ آئیں گے، جو میری سنت کے خلاف قوم کی رہنمائی کریں گے۔ تو ان میں اچھے کام بھی دیکھے گا اور برے کام بھی دیکھے گا۔ میں نے کہا: کیا اس قسم کے خیر کے بعد شر آئے گا؟ فرمایا: ہاں، ایسا شر آئے گا کہ جہنم کے دروازوں پر (یعنی ضلالت کے راستوں پر) بلانے والے بیٹھے ہوں گے،

اور جو لوگ ان کی دعوت قبول کریں گے، وہ ان کو جہنم میں پھینک دیں گے (ضلالت کی راہ پر لگا دیں گے)۔ میں نے عرض کی کہ ان کی کچھ صفات بیان کیجیے۔ فرمایا: وہ ہماری ہی قوم میں سے ہوں گے اور ہماری ہی زبان بولیں گے ..... میں نے کہا: اگر یہ زمانہ مجھ پر آ گیا تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت اور مسلمانوں کے امام کے ساتھ لگے رہو۔ میں نے عرض کی کہ اگر مسلمانوں کی جماعت بھی نہ ہو اور ان کا کوئی امام بھی موجود نہ ہو تو پھر میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا: ان سارے فرقوں سے الگ ہو جاؤ، اگرچہ تمھیں کسی درخت کو دانتوں سے مضبوط پکڑنا پڑے (یعنی درخت کے نیچے لوگوں سے الگ زندگی گزارنی پڑے) یہاں تک کہ جب تم پر موت آئے تو تم اسی حالت پر ہو۔''

(ماہنامہ ''فاران'' جون ۱۹۹۵، ص ۳۲-۳۳)

واقعہ یہ ہے کہ حدیث کا یہ ترجمہ اور اس حدیث کے بارے میں مولانا محترم کی اس شرح میں سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ مولانا ہمارے بزرگ ہیں، اور ہم ان کا تہِ دل سے احترام کرتے ہیں۔ مگر دین و شریعت کی تفہیم و توضیح کا معاملہ یقیناً اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کی راہ میں کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا احترام بھی آڑے نہ آئے۔ اس وجہ سے ہم مولانا سے دست بستہ یہ پوچھنا چاہیں گے کہ حدیث کے بارے میں ان کی پیش کردہ شرح اگر ''توضیحِ حدیث'' ہے، تو پھر آخر ''تضییعِ حدیث'' کس شے کا نام ہے؟

اس روایت کی مولانا محترم نے جو تشریح فرمائی ہے، اس کے حوالے سے مولانا سے ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ روایت میں جس امیر کی اطاعت کرنے کی بات ہوئی ہے، اس کے بارے میں یہ شرط کہاں بیان ہوئی ہے کہ وہ ''قرآن و سنت کا التزام'' کرنے والا ہو؟ اس کے برعکس، اس روایت میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کو بھی ''خیر'' ہی میں شمار کیا ہے، جب لوگوں میں تفرقہ نہیں ہو گا، اگرچہ ان کے امرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کی سنت کی خلاف ورزی کرتے ہوں گے۔

دوسرا سوال ہم مولانا محترم سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس روایت میں یہ بات کہاں بیان ہوئی ہے کہ ''جب تک اس حکمران نے طاغوت کی شکل اختیار نہ کی ہو اور قرآن و سنت سے منحرف نہ ہوا ہو، اس وقت تک اسی کا التزام کرنا دین کا تقاضا ہے۔'' مولانا کی اس بات کے بالکل برعکس، روایت کے جملوں سے تو یہ بات نکل رہی ہے کہ حکمران خواہ پیغمبر کی تعلیمات اور آپ کی سنت سے منحرف ہوں، تب بھی جب تک مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی قائم رہے، اس وقت تک حکمران کی اطاعت اور اس طرح مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی سے وابستہ رہا جائے۔

تیسرا سوال ہم مولانا محترم سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ روایت کے آخر میں مسلمانوں کے اجتماعی نظم کے درہم برہم ہونے کی جو تفصیل مولانا نے فرمائی ہے، یعنی یہ کہ ''قرآن و سنت کی بالادستی قبول کرنے والی کوئی حکومت موجود نہ ہو اور اس نظام کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنے والی ایسی دینی جماعت بھی موجود نہ ہو جو قرآن و سنت کا التزام کرتی ہو اور تم اپنے اندر تنہا حالات کا مقابلہ کرنے یا جماعت بنانے کی قوت بھی نہ پاتے ہو...''، اس ساری تفصیل کا ماخذ روایت کے الفاظ میں کہاں ہے؟ روایت کے الفاظ سے تو جو بات مترشح ہو رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی قائم ہو تو اس سے وابستہ رہا جائے اور اگر ایسا کوئی نظم قائم نہ ہو تو تمام متحارب گروہوں سے الگ ہو کر رہا جائے۔ مگر مولانا صاحب کو اس بات پر اصرار ہے کہ ان کی بیان کردہ ساری تفصیل بھی روایت کے الفاظ میں موجود ہے۔ ہماری درخواست ہے کہ وہ مہربانی فرما کر روایت کے ان الفاظ کی طرف ہماری رہنمائی فرمادیں، جن کی بنیاد پر انھوں نے روایت کی یہ شرح فرمائی ہے۔

ہمارے نزدیک، اصل بات یہ ہے کہ روایت میں حضرت حذیفہ کا سوال کہ ''یارسول اللہ، ہم لوگ جاہلیت اور شر کی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خیر دیکھنا نصیب کیا۔ کیا اس خیر کے بعد دوبارہ شر آئے گا؟'' اصلاً عرب کی اس بدامنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جو اسلام سے پہلے پورے عرب پر چھائی ہوئی تھی۔ عربی زبان میں معاشرے میں پھیلنے والی بدامنی کے لیے لفظ ''شر'' کا استعمال معروف ہے۔ چنانچہ، اگر غور کیجیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جو جواب دیا، وہ بھی ہماری اس بات کی تائید کر رہا ہے۔ آپ کا ارشاد کہ خیر کا ایک زمانہ وہ ہو گا جس میں ''ایسے لوگ آئیں گے، جو میری سنت سے ہٹ کر قوم کی رہنمائی کریں گے''، اس بات کا واضح قرینہ ہے۔

اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے، روایت پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حذیفہ کے مذکورہ سوال کے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی عنایت سے تفرقے سے پاک مسلمانوں کا جو مضبوط نظم قائم ہو گیا ہے، یہ اسی طرح قائم نہ رہے گا، کچھ عرصے بعد اس میں اختلال پیدا ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس موقع پر کچھ خانہ جنگی جیسی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اس ''شر'' کے بعد پھر کوئی امن وامان (خیر) کی کیفیت بھی آئے گی؟ آپ نے فرمایا: آئے گی، مگر اس میں کچھ ملاوٹ ہو گی۔ اس کی تفصیل کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس میں اگرچہ مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی قائم ہو گا اور امن وامان بحال ہو جائے گا، تاہم اس وقت مسلمانوں کے لیڈروں میں شریعت سے بہت کچھ انحراف پیدا ہو

جائے گا۔ ظاہر ہے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہی میں مضمر ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ان امرا کی اطاعت پر قائم رہنا اور اپنے نظمِ اجتماعی سے جڑے رہنا چاہیے، تاکہ وہ اس ''خیر'' میں کسی ''شر'' یا بد نظمی کو پھیلانے کا باعث نہ بنیں۔ اس کے بعد حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ اس ''خیر'' کے بعد بھی کوئی ''شر'' یا بد نظمی کی حالت پیدا ہو گی، آپ نے فرمایا: ہاں بہت برے حالات ہوں گے۔ مسلمان تفرقے کا شکار ہو جائیں گے۔ ہر گروہ تمھیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے گا۔ مگر تم اس صورت میں ان تمام گروہوں سے الگ رہتے ہوئے، جیسا کچھ بھی مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی ہو، اس سے جڑے رہنا اور مسلمانوں کے امیر کی اطاعت کرتے رہنا۔ اس پر حضرت حذیفہ نے عرض کیا کہ اگر یہ تفرقہ اتنا شدید ہو جائے کہ کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ مسلمانوں کا امیر ہے، گویا مسلمانوں کا کوئی نظم باقی نہ رہے، تو اس صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں تم ہر گروہ سے الگ ہو کر، اپنی باقی زندگی تنہا بسر کر دینا۔ ظاہر ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب بڑا حکیمانہ جواب ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ جب خانہ جنگی کی ایسی صورت پیدا ہو جائے، اس میں عام مسلمان اگر سارے گروہوں سے کٹ کر الگ رہیں گے تو اس بات کا امکان رہے گا کہ ان کی تلوار کسی دوسرے مسلمان کی گردن پر نہیں چلے گی۔ ایسی صورت میں عام مسلمانوں کا تمام گروہوں سے الگ رہنا ہی ان گروہوں کی طاقت اور قوت کو کم کر دے گا اور اس طرح امید ہے کہ انھیں ان کی شر انگیزی کا نشانہ نہیں بننے دے گا۔ مگر حیرت ہے کہ مولانا محترم یہ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلمان اگر اپنی کوئی ''جماعت'' بنا سکتا ہو تو بنا ڈالے۔ کیا مولانا محترم کی رائے یہ ہے کہ جب مسلمانوں میں اتنا تفرقہ پیدا ہو جائے، تو یہ بندۂ مومن کی شان سے فروتر ہے کہ وہ صلاحیت اور ایمانی قوت رکھنے کے باوجود، اس تفرقے میں اپنا حصہ نہ ڈالے اور امتِ مرحومہ میں مزید تفرقہ ڈالنے کی کوشش نہ کرے؟

(جاری)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

تختِ سلیمان کے دھڑ کی حقیقت

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ خدا کی طرف سے پیش آنے والی یہ آزمایش جہاں عام انسانوں میں سے کھرے اور کھوٹے کو ممیز کر دیتی ہے، وہاں یہ انبیا و صالحین کے لیے ان کی تربیت، درجات کی بلندی اور خدا کے قرب کا باعث ہوتی ہے۔ سورۂ صٓ کی آیات ۳۴ اور ۳۵ میں اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام پر آنے والی ایک آزمایش کا ذکر ہے۔ قرآن مجید کا یہ مقام تاویل کے اعتبار سے مشکل ترین مقامات میں شمار ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس کی تاویل میں بڑی محنت کی ہے۔ ذیل میں ہم اس کی تاویل میں پیش کی جانے والی مختلف آرا اور ان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ وما توفیقنا الا باللّٰہ۔

سورۂ صٓ کی زیر مطالعہ آیات حسب ذیل ہیں:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ. قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ.

ان آیات کا سادہ ترجمہ یہ ہے:

”اور ہم نے سلیمان کو جانچا اور اس کی کرسی پر جسد (یعنی ایک دھڑ[1]) ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور دعا کی: اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہ ہو۔ تو

۱۔ بعض مفسرین نے 'جسدا' کو 'القینا' کے مفعول محذوف سے حال مانا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا ترجمہ ”ایک دھڑ ڈال دیا“ کے بجائے اسے ”ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا“ بنتا ہے۔

بڑا ہی بخشنے والا ہے۔''

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایک ایسی آزمایش آئی تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے تخت پر کسی دھڑ کو ڈال دیا تھا۔ وہ اس صورت حال کو دیکھنے کے بعد مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، اس سے معافی مانگی اور مزید یہ کہ اس سے اپنے لیے ایک بے مثل بادشاہی کی دعا کی۔

مذکورہ آیات میں تاویل کی حسب ذیل مشکلات ہیں:

۱۔ جسد سے کیا مراد ہے؟

۲۔ جسد کے کرسی پر ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟

۳۔ اس میں آزمایش کس پہلو سے تھی؟

۴۔ اس موقع پر آپ نے اپنے لیے بے مثل بادشاہت ہی کی درخواست کیوں کی؟

ان آیات کی تاویل میں درج ذیل آرا پیش کی گئی ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پہلی رائے

پہلی رائے یہ کہ ان آیات میں 'جسد' سے مراد ایک شیطان ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک غفلت کے نتیجے میں آپ کے تخت پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ اس کی وجہ سے ایک سخت فتنے سے دوچار ہوئے۔ آپ کی وہ غفلت کیا تھی۔ اس کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ آپ کو کسی جزیرہ میں واقع شہر صیدون کے بادشاہ کے متعلق بعض ایسی خبریں پہنچیں، جن کے نتیجے میں آپ نے اس پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ آپ اپنے لاؤ لشکر سمیت دوش ہوا پر اس شہر میں جا پہنچے۔ اس بادشاہ سے جنگ کی اور اسے قتل کر دیا۔ مال غنیمت میں آپ کے ہاتھ اس کی بیٹی بھی آئی۔ یہ مسلمان ہو گئی۔ آپ نے اس سے شادی کر لی۔ چنانچہ یہ آپ کے حرم میں داخل ہو گئی۔ شادی کے کافی عرصہ بعد تک بھی یہ اپنے مرنے والے باپ کو نہ بھول سکی۔ اسے یہ یاد کرتی اور روتی رہتی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر سلیمان علیہ السلام کے حکم پر جنات نے اس کے لیے اس کے باپ کا ہم شکل ایک بت بنا دیا اور اسے وہی لباس پہنا دیا جو وہ پہنا کرتا تھا۔ یہ ملکہ اسے دیکھ کر اپنا دل مطمئن کر لیتی۔ لیکن جلد ہی اس نے اور اس کی کنیزوں نے جو اس کی قوم سے تعلق رکھتی تھیں اس بت کی پرستش شروع کر دی۔ پرستش کا یہ سلسلہ چالیس دن تک جاری رہا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے یکسر بے خبر تھے۔ بالآخر آپ کے وزیر اعظم آصف بن برخیا نے آپ کو اطلاع دی کہ آپ کے محل میں بت کی پرستش کی جا رہی ہے۔ آپ

نہایت برہم ہوئے اور اس بت کو توڑ دیا، ملکہ کو سزا دی اور اپنی طرف سے توبہ کے لیے یہ کیا کہ تن تنہا بیابان میں نکل گئے، راکھ کا فرش بچھایا اور اس پر بیٹھ کر اللہ کے سامنے گڑگڑائے اور اپنی اس غفلت پر خدا سے معافی کے خواست گار ہوئے۔ لیکن آپ کے مقدر میں اس غفلت کی بنا پر ایک سخت فتنے میں مبتلا ہونا لکھا تھا۔ چنانچہ آپ اس فتنے میں مبتلا ہوئے۔[۲]

اس ابتلا کا واقعہ یوں ہے کہ آپ کا سارا اقتدار ایک انگشتری میں تھا، جسے آپ ہر وقت پہنے رکھتے اور صرف قضائے حاجت یا بیویوں سے ملاقات ہی کے وقت اپنے سے الگ کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام وہ انگشتری اپنی ایک کنیز امینہ کے سپرد کر دیتے تھے۔ جب وہ وقت آ گیا، جس میں اس فتنے کا وقوع مقدر تھا تو رفع حاجت کے لیے جاتے ہوئے، جونہی آپ نے وہ انگشتری امینہ کو دی، ایک جن امینہ پر آپ کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس سے وہ انگشتری لے لی۔ انگشتری کا اس جن کے ہاتھ میں کیا آنا تھا کہ سب اقتدار اس کے قبضے میں آ گیا۔

سلیمان علیہ السلام کو اب کوئی پہچانتا بھی نہ تھا۔ ان کی شکل و صورت بدل چکی تھی جب وہ اپنے بارے میں بتاتے کہ اصل سلیمان میں ہوں تو لوگ ان کا مذاق اڑاتے، انھیں گالیاں دیتے اور ان پر مٹی پھینکتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سلیمان علیہ السلام نے جان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمایش ہے۔ چنانچہ آپ نے خدا کی رضا پر راضی ہوتے ہوئے، اقتدار اور تخت و تاج کی طرف سے اپنا دھیان ہٹایا اور نان جویں کی تلاش میں لگ گئے۔ آپ کو ماہی گیروں کے ہاں کچھ کام مل گیا۔ آپ ان کی مچھلیاں ڈھوتے تھے اور وہ آپ کو اس محنت کے عوض روزانہ دو مچھلیاں دے دیتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام اس آزمایش میں چالیس دن یعنی اتنا ہی عرصہ مبتلا رہے، جتنا عرصہ آپ کے محل میں غیر اللہ کی پرستش کی گئی تھی۔[۳] پھر خدائے کریم نے آپ پر دوبارہ نظر کرم فرمائی۔

۲۔ فتنے میں پڑنے کی وجوہ اس سے مختلف بھی بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ نے کاروبار سلطنت سے مسلسل تین دن گریز کیا جس کی سزا کے طور پر آپ فتنے میں ڈال دیے گئے۔ دوسری یہ کہ آپ نے ایک شیطان سے پوچھا: تم لوگوں کو کس طرح فتنے میں مبتلا کرتے ہو۔ تو اس نے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں آپ ذرا مجھے اپنی بادشاہت کی انگشتری دے دیں۔

۳۔ بعض لوگوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ اس سارے عرصے میں سلیمان علیہ السلام کی ازواج مطہرات کی عصمت بھی اس شیطان سے محفوظ نہ رہی، لیکن بہت سے دوسرے علما نے اس کا انکار کیا ہے۔

چنانچہ اس نے اہل دربار کو اس شک میں مبتلا کر دیا کہ سلیمان کی کرسی پر اس وقت جو شخص براجمان ہے، وہ سلیمان نہیں ہے۔ بلکہ ان کے روپ میں کوئی اور ہے۔ اس شک کے بعد صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لیے انھوں نے اسے آزمانا چاہا، اور اس کے سامنے تورات کھولی تاکہ وہ اس میں سے پڑھ کر انھیں کچھ بتائے، لیکن وہ بھاگ گیا اور جاتے جاتے حضرت سلیمان کی انگوٹھی سمندر میں پھینک گیا تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے، لیکن خدا کی قدرت کہ اس انگوٹھی کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ پھر وہی مچھلی حضرت سلیمان کو ماہی گیروں سے مزدوری میں مل گئی۔ حضرت سلیمان نے اس مچھلی کو پکانے کے لیے تیار کرتے ہوئے جونہی اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے اپنی انگشتری پالی۔ انگشتری کا پہننا تھا کہ کیا وحوش و طیور اور کیا جن وانس، سب سلام کرتے ہوئے، حاضر ہو گئے۔ اور یوں وہ سخت آزمایش اپنے اختتام کو پہنچی۔ چنانچہ سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈالنے سے مراد یہی شیطان ہے۔ جو ان کی کرسی پر قابض ہو گیا تھا اور چالیس دن سلیمان بن کر حکومت کرتا رہا۔

یہاں تک آیت ۳۴ کے اجمال کی تفصیل تھی۔ آیت ۳۵ کے بارے میں اس رائے کے حاملین کا یہ کہنا ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے گناہ کی معافی مانگنے کے بعد خدا سے ایسی بادشاہی مانگی جس پر جنات یا شیاطین قادر نہ ہو سکیں۔ یہ رائے ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمہ اللہ، سعید بن جبیر رحمہ اللہ، حسن رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کی گئی ہے۔ ابن کثیر اس رائے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے قوی سند کے ساتھ مروی ہے۔

دوسری رائے

دوسری رائے یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے ہاں بیس سال کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا۔ شیاطین نے یہ دیکھ کر کہا کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور سلیمان کے بعد تخت پر بیٹھ گیا تو ہم سلیمان کے بعد پھر اس کی غلامی میں گرفتار رہیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اسے قتل کرنے کی سازش کی۔ سلیمان علیہ السلام کو اس سازش کا پتا چل گیا تو انھوں نے اس لڑکے کو بادلوں میں چھپا دیا تاکہ جنات کو اس کی خبر ہی نہ ہو۔ سلیمان علیہ السلام کا یہ اقدام ہی وہ فتنہ تھا جس میں وہ مبتلا ہوئے، یعنی انھوں نے خدا پر توکل نہیں کیا، بلکہ خود سے ایک اقدام کر کے لڑکے کو بادلوں میں چھپا دیا۔ خدا کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ چنانچہ ایک موقع پر جبکہ آپ اپنی جنگی مہمات میں مصروف تھے، وہ لڑکا مردہ حالت میں آپ کے تخت پر آن گرا۔ تب سلیمان علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ انھوں نے خدا پر توکل نہیں کیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لہٰذا انھوں نے خدا سے بہت توبہ کی۔ پس ان آیات میں جسد سے مراد وہ مردہ لڑکا ہے جو تخت پر آن گرا تھا اور سلیمان علیہ السلام کا خدا پر توکل کرنے کے بجائے بادلوں پر اعتماد کرنا وہ فتنہ تھا جس میں وہ مبتلا ہوئے تھے۔

یہ رائے طبرانی ''الاوسط'' میں لائے ہیں۔ ابن مردویہ نے اسے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند[۴] سے روایت کیا ہے۔ الامامیہ نے اس رائے کو ابو عبد اللہ سے روایت کیا ہے اور یہی رائے شعبی سے بھی روایت کی گئی ہے۔

تیسری رائے

تیسری رائے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ایک واقعہ مروی ہے کہ انھوں نے ایک دن یہ قسم کھائی کہ میں آج رات اپنی نوے بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو بڑا ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہوگا۔ اس موقع پر آپ نے ان شاء اللہ نہ کہا، حالانکہ فرشتے نے آپ کے دل میں یہ بات ڈالی بھی کہ آپ ان شاء اللہ کہیں، لیکن آپ اس وقت کی اپنی خاص کیفیت کی وجہ سے یہ بھول گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی بیویوں میں سوائے ایک کے کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی اور اس نے بھی جو بچہ جنا وہ آدھے دھڑ کا تھا۔ یعنی اس کا ایک ہی بازو، ایک ہی پہلو اور ایک ہی ٹانگ تھی۔ یہاں تک کا مضمون تو حدیث میں موجود ہے، لیکن اس کے بعد تفاسیر یہ کہتی ہیں کہ دائی نے یہی بچہ لا کر سلیمان علیہ السلام کے تخت پر ڈال دیا۔ چنانچہ یہ بچہ ہی وہ دھڑ ہے جس کے آپ کی کرسی پر ڈالنے کا ذکر 'والقینا علی کرسیه جسداً' کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ان شاء اللہ نہ کہنا وہ فتنہ تھا جس میں آپ مبتلا ہوئے۔ اس عجیب الخلقت بچے کو دیکھ کر آپ نے توبہ و انابت اختیار کی۔

ان آیات کی یہ تفسیر ''صحیح بخاری'' اور ''مسلم'' کی ان متفق علیہ روایات کے حوالے سے بیان کی گئی ہے جنھیں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ سند کے پہلو سے اس پر بحث کرنا مشکل ہے۔

چوتھی رائے

چوتھی رائے ان آیات کے بارے میں یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گئے

۴۔ اس کی سند ضعیف ہے، لیکن مفسرین نے اسے ایک رائے ہی کے طور پر بیان کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھے اور اس مرض کی وجہ سے وہ بالکل ایک بے جان لاشہ بن کر رہ گئے، چنانچہ آپ اپنی کرسی پر بیٹھتے تو ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک دھڑ سا پڑا ہوا ہے۔ اس رائے کے مطابق 'القینا علی کرسیہ جسداً' اصل میں 'القیناہ علی کرسیہ جسداً' ہو گا۔ 'جسداً' اس میں مفعولی ضمیر غائب سے حال واقع ہو رہا ہے یعنی یہ لفظ سلیمان علیہ السلام کی حالت بیان کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ 'ثم اناب' سے یہ مراد لیتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حالت صحت کی طرف لوٹے۔ چنانچہ جب وہ صحت یاب ہو گئے تو انھوں نے مغفرت کی دعا کی۔ آیت ۳۵ کی شرح کرتے ہوئے اس رائے کے قائلین کہتے ہیں کہ مرض کی وجہ سے آپ نے دنیا کی نعمتوں کا زوال پذیر ہونا جان لیا تو اپنے لیے دنیا میں ایسی سلطنت مانگی جو چھن کر دوسروں کے پاس نہ جائے۔ ان آیات کی یہ تاویل تفسیر ''روح المعانی'' میں ابو مسلم اور بعض دوسرے لوگوں کی رائے کی حیثیت سے بیان کی گئی ہے۔ امام رازی نے اس رائے کو محقق علما کے ایک گروہ کی طرف سے بیان کردہ رائے کے طور پر پیش کیا ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پانچویں رائے

پانچویں رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس طرح آزمایا کہ آپ پر شدید خوف یا بعض اطراف سے متوقع خطرے کا احساس مسلط کر دیا۔ آپ اس شدید خوف یا خطرے کی وجہ سے بالکل کمزور ہو گئے۔ چنانچہ آپ اپنے تخت پر یوں پڑے رہتے جیسے کوئی دھڑ پڑا ہو۔ پھر اللہ نے آپ کو اس خوف سے نجات دی اور آپ کو دوبارہ صحت عطا فرمائی۔ اس رائے کے مطابق بھی 'جسداً' کا لفظ خود سلیمان علیہ السلام کی حالت بیان کر رہا ہے۔ یہ رائے امام رازی رحمہ اللہ کی ہے اور اسے انھوں نے ''تفسیر کبیر'' میں بیان کیا ہے۔

آرا کا تجزیہ

زیر بحث آیات کی تاویل میں عموماً یہی پانچ آرا پیش کی گئی ہیں۔ اب ہم ان آرا کا تجزیہ کرتے اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کوئی رائے ہمیں آیات کی صحیح تاویل تک پہنچاتی ہے یا نہیں اور کیا کوئی رائے ان سب سوالوں کا تسلی بخش جواب دیتی ہے جو ان آیات کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں (آیات کے بارے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا ذکر ہم نے ابتدا میں کر دیا ہے، انھیں وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔)

پہلی رائے کا تجزیہ

جہاں تک پہلی رائے کا تعلق ہے جس میں سلیمان علیہ السلام کی انگشتری چھن جانے اور آپ کے تخت پر

ایک جن کے قابض ہو جانے کا ذکر ہے، اس کے مطابق سوالات کے جواب یہ بنتے ہیں:

۱۔ جسداً سے مراد وہ شریر جن ہے جس نے دھوکے سے سلیمان علیہ السلام کی انگشتری حاصل کر لی تھی۔

۲۔ کرسی پر جسد ڈالنے کا مطلب اس جن کا آپ کے تخت پر قابض ہو جانا ہے۔

۳۔ سلیمان علیہ السلام جس آزمایش میں ڈالے گئے تھے، وہ یہ تھی کہ آپ عرش سے یک دم فرش پر پھینک دیے گئے۔

۴۔ آپ سے چونکہ سلطنت چھن گئی تھی، لہٰذا آپ نے خدا سے سلطنت ہی کے حصول کی دعا کی اور ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ یہ سلطنت میرے علاوہ کسی اور کو نہ ملے، یعنی کوئی پہلے کی طرح میری حکومت پر قابض نہ ہو جائے۔

اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے امام رازی نے اپنی ''تفسیر کبیر'' میں چار نکات بیان کیے ہیں: پہلا یہ کہ اگر شیاطین انبیا کی شکلیں اختیار کرنے پر قادر ہوں تو پھر نبوت کا سارا سلسلہ ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ شرائع پر اعتماد کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی اور سارے کا سارا دین جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔ چنانچہ کیا معلوم کہ حضرت محمد، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی شکل میں شیاطین ہی لوگوں سے ہم کلام ہوئے ہوں۔ دوسرا یہ کہ اگر شیطان اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام سے اس طرح کا معاملہ کر سکتا ہے تو پھر علما اور صلحا تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے، انھیں تو وہ قتل بھی کر دیتا، ان کی تصانیف ضائع کر دیتا اور ان کے گھر بار تباہ کر دیتا۔ چونکہ شیطان کی طرف سے اس طرح کا معاملہ کسی ایک عالم کے ساتھ بھی پیش نہیں آیا، لہٰذا انبیا کے ساتھ اس طرح کا معاملہ ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ تیسرا یہ کہ یہ بات اللہ کی حکمت کے بالکل منافی ہے کہ وہ اپنے نبی سلیمان علیہ السلام کی بیویوں پر شیطان کو تسلط دے دے۔ یہ تو بڑی ہی قبیح بات ہے، اس کا وقوع کیسے ممکن ہے۔ اور چوتھا نکتہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر یہ مانا جائے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیوی کو اس بت پرستی کی اجازت دی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس نبی نے کفر کیا، یہ کیسے ممکن ہے اور اگر آپ کی بے خبری میں بت پرستی ہوئی تو پھر اس پر آپ کا مواخذہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس تنقید کی رو سے یہ واقعہ نہ صرف خدا کی حکمت کے خلاف ہے، بلکہ شان نبوت کے بھی سراسر منافی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اس رائے کو کسی صورت بھی قبول نہیں کرتے۔ اس میں 'جسداً' سے وہ جن مراد لیا گیا ہے جو آپ کے تخت پر قابض ہو گیا تھا اور چالیس دن تک حاکم بنا رہا۔ حالانکہ 'جسداً' کا لفظ تو اپنے اندر اس کی کوئی گنجایش نہیں رکھتا

کہ اس سے ایک بھرپور فعال وجود مراد لیا جائے۔ 'جسداً' کا لفظ تو اس موقع استعمال میں اپنے اندر بے حس و حرکت اور جامد ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی ایک واضح نظیر بھی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی لفظ سونے کے اس بچھڑے کے لیے بھی استعمال کیا ہے، جسے سامری نے بنا کر بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا اور کہا کہ یہ تمھارا خدا ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید نے 'جسداً له خوار' کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا مطلب ہے ''ایک دھڑ ڈکرانے والا''۔ قرآن مجید یہاں 'جسداً' کے لفظ سے اس کا بے جان اور بے حس و حرکت ہونا بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ اس لفظ کا اطلاق ایک ایسے وجود پر نہیں کیا جا سکتا جس میں بھرپور فعالیت پائی جائے اور جو صاحب اقتدار بن کر بیٹھ گیا ہو۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ان آیات سے متصل اگلی آیات یہ بتا رہی ہیں کہ اس آزمایش سے کامیابی کے ساتھ نکلنے کے بعد ہی سلیمان علیہ السلام کو ہواؤں اور شیاطین پر اقتدار دیا گیا تھا۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں:

فَسَخَّرۡنَا لَهُ الرِّيۡحَ تَجۡرِيۡ بِاَمۡرِهٖ رُخَآءً حَيۡثُ اَصَابَ. وَالشَّيٰطِيۡنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ. وَّاٰخَرِيۡنَ مُقَرَّنِيۡنَ فِي الۡاَصۡفَادِ. (ص ۳۸: ۳۶-۳۸)

''(سلیمان نے بے مثل بادشاہی مانگی) تو ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے سازگار ہو کر چلتی تھی، جہاں کہیں کا وہ قصد کرتا اور سرکش جنوں کو بھی اس کے لیے مسخر کر دیا۔ نہایت ماہر معماروں اور غوطہ خوروں کو اور دوسرے جنوں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہتے۔''

قرآن مجید کی ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس آزمایش کے بعد سلیمان علیہ السلام کو ہواؤں اور جنوں پر کنٹرول دیا گیا تھا، لیکن زیر بحث رائے اس بات پر مبنی ہے کہ سلیمان علیہ السلام پہلے سے جنات اور ہواؤں پر کنٹرول رکھتے تھے۔ پس یہ رائے قرآن کی صریح نصوص سے متصادم ہے۔

چوتھی اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ سارا واقعہ محض ایک من گھڑت کہانی ہے جسے ان آیات کے اجمال کی تفصیل میں پیش کر دیا گیا ہے۔ یہ بات ہی خلاف حقیقت ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا اقتدار کسی انگشتری میں تھا اور وہ کبھی گم ہوئی تھی اور اس کے گم ہونے کے نتیجے میں سلیمان علیہ السلام کو حکومت سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ نہ قرآن و حدیث آپ کی کسی ایسی انگشتری کا پتا دیتے ہیں اور نہ بائیبل ہی اس کی خبر رکھتی ہے، البتہ افسانوی

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

نوعیت کی اسرائیلی روایت میں ضرور اس کا ذکر آتا ہے۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہ پورا افسانہ از سرتاپا خرافات پر مشتمل ہے جنھیں نو مسلم اہل کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا ہے اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مجملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان میں نقل کر دیا۔ حالانکہ نہ انگشتری سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے، نہ حضرت سلیمان کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیا کی شکلیں بنا کر آئیں اور خلق خدا کو گمراہ کریں اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے۔ جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری امت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔ آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمایش سلیمان کو پیش آئی اور انھوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا، لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے۔ تعجب ہے جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی انھوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں۔“ (تفہیم القرآن ۴/۳۳۶-۳۳۷)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دوسری رائے کا تجزیہ

دوسری رائے کے مطابق جس میں سلیمان علیہ السلام کے اپنے بیٹے کو بادلوں میں چھپانے کا ذکر ہے، آیات کے اجمال کی تفصیل یہ بنتی ہے:

۱۔ 'جسداً' سے مراد وہ لڑکا ہے جو بادلوں سے مردہ حالت میں سلیمان علیہ السلام کی کرسی پر گرا تھا۔

۲۔ کرسی پر ڈالنے کا مطلب لڑکے کو بادلوں سے کرسی پر گرا دینا ہے۔

۳۔ فتنہ یہ تھا کہ سلیمان علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے کی جان کو خطرہ محسوس کیا تو خدا پر توکل کرنے کے بجائے اسے موت سے بچانے کی تدابیر کرنے لگ پڑے۔

۴۔ اس موقع پر بے مثل بادشاہی مانگنے کی وجہ اس رائے میں بیان نہیں کی گئی۔

اس تاویل میں بھی بنیادی غلطی یہی ہے کہ یہ متصل بعد کی آیات سے متضاد ہے۔ حضرت سلیمان کو ہواؤں پر تصرف اس فتنے سے پہلے نہیں، بلکہ اس کے بعد دیا گیا تھا۔ دوسری غلطی اس تاویل میں یہ ہے کہ اس میں

القاے جسد (کرسی پر دھڑ ڈالنے) کو آزمایش کا حصہ قرار نہیں دیا گیا، بلکہ اسے خدا پر توکل نہ کرنے کی سزا قرار دیا جا رہا ہے، یعنی اس تاویل کے مطابق ان آیات کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ہم نے سلیمان کو اس کے بیٹے کے حوالے سے آزمایا، وہ اس آزمایش میں ناکام ہو گیا تو ہم نے سزا کے طور پر اس کے بیٹے کو اس کے تخت پر مردہ حالت میں پھینک دیا، پھر اس نے توبہ کی اور کہا...۔ ان آیات کا اگر یہ مطلب ہوتا تو ضروری تھا کہ 'ولقد فتنا' پر 'القینا' کا عطف واؤ کے بجائے 'فا' وغیرہ سے ہوتا، چنانچہ آیت کے الفاظ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ القاے جسد ہی اصل فتنہ یا فتنے کا اصل قرار پائے، تیسری بات یہ بھی ہے کہ اس میں پہلی آیت کا جو مفہوم بھی لیا جا رہا ہے، وہ دوسری آیت میں موجود بے مثل بادشاہی کی دعا سے بالکل غیر متعلق ہے چنانچہ اس صورت میں دونوں آیات بالکل بے ربط محسوس ہوتی ہیں، پس یہ رائے بھی کسی طرح قبول نہیں کی جا سکتی۔

تیسری رائے کا تجزیہ

تیسری رائے میں سلیمان علیہ السلام کے ایک ہی رات اپنی نوے بیویوں کے پاس جانے کا ذکر ہے، اس رائے کے مطابق سوالوں کے جواب ترتیب سے یہ بنتے ہیں:

۱۔ جسد سے مراد وہ ادھورا بچہ ہے جو سلیمان علیہ السلام کے ہاں پیدا ہوا تھا۔

۲۔ کرسی پر القاے جسد سے مراد دائی کا اس ادھورے بچے کو آپ کے تخت پر لا کر ڈال دینا ہے۔

۳۔ آپ نے مستقبل کے پردے سے رونما ہونے والی چیز کے بارے میں بات کی، مگر خدا کی مرضی کے ساتھ اس کا مشروط قرار دینا آپ بھول گئے۔ یہ بھولنا ہی وہ فتنہ تھا جس میں آپ گرفتار ہوئے۔

۴۔ اس موقع پر بے مثل بادشاہی کیوں مانگی؟ اس سوال کا جواب اس رائے میں بھی سامنے نہیں آتا۔

کہنے کو تو یہ رائے ''بخاری'' و ''مسلم'' کی متفق علیہ روایت پر مبنی ہے، لیکن آپ روایت کو دیکھیں تو قطع نظر اس بات کے کہ وہ درایت کی کسوٹی پر پوری اترتی بھی ہے یا نہیں، اس میں جس ادھورے بچے کے پیدا ہونے کا ذکر ہے، اس کے بارے میں اس حدیث میں یہ بالکل نہیں بتایا گیا کہ یہی وہ جسد ہے، جسے خدا نے ان کی کرسی پر ڈالا تھا پھر مزید یہ کہ اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم نہیں ہوتی ہے کہ یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کی شرح کے طور پر بیان فرمائی تھی۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی ہریرة قال: قال سلیمان ''ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ

لاطوفن اللیلة علی تسعین امراة. کل تلد غلاما یقاتل فی سبیل اللّٰہ فقال له صاحبه قال سفیان یعنی الملک قل ان شاء اللّٰہ فنسی فطاف بهن فلم تات امراة منهن بولد الا واحدة بشق غلام فقال ابوہریرہ یرویه قال لو قال ان شاء اللّٰہ لم یحنث وکان درکا فی حاجته.

(بخاری، کتاب کفارات الایمان)

وسلم نے فرمایا: سلیمان نے قسم کھائی کہ میں ضرور آج رات اپنی نوے بیویوں کے پاس جاؤں گا۔ ان میں سے ہر بیوی ایک لڑکا جنے گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو گا۔ سفیان راوی بتاتے ہیں کہ ان کے ساتھی یعنی فرشتے نے کہا: ان شاء اللہ کہیے، تو وہ بھول گئے۔ پھر آپ اپنی بیویوں کے پاس گئے بھی، لیکن ان میں سے صرف ایک عورت کے ہاں لڑکے کا آدھا جسم پیدا ہوا۔ پھر ابوہریرہ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ ان شاء اللہ کہتے تو ان کی قسم رائگاں نہ جاتی، بلکہ یہ (ان شاء اللہ کہنا) ان کے مقصد کے حصول (کا ذریعہ) ہوتا۔''

اس حدیث کو دیکھ لیجیے، اس میں بس ایک ادھورے بچے کے پیدا ہونے کا ذکر تو ہے، لیکن یہ ادھورا بچہ ہی وہ جسد ہے جسے تخت پر ڈالا گیا تھا، حدیث اس سے بالکل ہی غیر متعلق ہے اور نہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان آیات کے اجمال کی تفصیل کر رہی ہے۔

خود امام بخاری اس حدیث کو کتاب الجہاد، کتاب الانبیا اور کتاب الایمان والنذور وغیرہ میں تو لائے ہیں، لیکن کتاب التفسیر میں سورۂ ص کی تفسیر کے تحت اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا، بلکہ آیت 'وهب لی ملکا' کے تحت ایک اور ہی روایت نقل کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں بھی وہ نقص ہے کہ فتنے اور القاے جسد کو الگ الگ قرار دیا گیا ہے اور دوسری چیز کو پہلے کی سزا مانا گیا ہے۔ حالانکہ آیت سے یہ صاف پتا چلتا ہے کہ القاے جسد یعنی دھڑ کا ڈالنا فتنے کا اصل حصہ بالکل اصل فتنہ تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس رائے کے قائل حضرات کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان شاء اللہ نہ کہنے پر اس وقت تنبہ ہوا جب انھوں نے دیکھا کہ جو کچھ میں نے چاہا تھا، وہ بالکل نہیں ہوا۔ میرا تو خیال یہ تھا کہ میرے ہاں ایسے نوے بچے ضرور پیدا ہوں گے جو بڑے ہو کر جہاد کریں گے، لیکن ان کی جگہ یہ ایک ادھورا بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ یقیناً یہ میرے ان شاء اللہ نہ کہنے کا نتیجہ

ہے۔اس رائے میں یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس ادھورے بچے کی پیدایش تک اپنی باقی ۸۹ بیویوں کے حاملہ نہ ہونے کے باوجود نوے بچوں کی امید میں مبتلا رہے اور جب یہ ادھورا بچہ سامنے آگیا تو ان کو تنبہ ہوا کہ میری وہ خواہش ان شاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے پوری نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ تنبہ انھیں اس وقت ہو جانا چاہیے تھا، جب انھیں معلوم ہوا ہو گا کہ میری ۸۹ بیویاں تو حاملہ ہی نہیں ہوئیں۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ اس حدیث پر درایۃً بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ حدیث حضرت ابوہریرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود ''بخاری'' میں مختلف مقامات پر یہ روایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹ اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے اور باعتبار روایت اس کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا، لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہر گز نہ فرمائی ہو گی، جس طرح وہ نقل ہوئی ہے، بلکہ آپ نے غالباً یہود کی یاوہ گویوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر بطور مثال بیان فرمایا ہو گا۔اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضور خود بطور واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی روایت کو محض صحت سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشا اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دم لیے فی گھنٹہ ۶ بیوی کے حساب سے مسلسل دس گیارہ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضور نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہو گی۔ پھر حدیث میں یہ بات کہیں نہیں بیان کی گئی کہ قرآن مجید میں جس جسد کے ڈالنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد یہی ادھورا بچہ ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضور نے یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔ علاوہ بریں اس بچے کی پیدایش پر حضرت سلیمان کا استغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے استغفار کے ساتھ یہ دعا کیوں مانگی کہ ''مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔'' (تفہیم القرآن ۴/ ۳۳۷-۳۳۸)

چنانچہ زیر بحث آیات کی تاویل میں یہ رائے بھی اس ساری تنقید کے بعد قابل قبول نہیں رہتی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

چوتھی رائے کا تجزیہ

چوتھی رائے جو ان آیات کی تاویل میں پیش کی گئی ہے، اس میں آپ کی شدید بیماری کی وجہ سے اپنی کرسی پر ایک دھڑ کی طرح پڑے رہنے کا ذکر ہے۔ اس کی رو سے ہمارے سوالوں کے جواب یہ بنتے ہیں۔

۱۔ جسد سے مراد خود حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں جو بیماری کی شدت کی وجہ سے ایک لاشہ سا بن کر رہ گئے تھے۔

۲۔ جسد کے کرسی پر ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی کرسی پر بیماری کی وجہ سے دھڑ کی طرح پڑے رہتے۔

۳۔ بیماری کی شدت ہی آپ کے لیے فتنہ یعنی آزمایش تھی۔

۴۔ مرض کی وجہ سے آپ نے دنیا کی نعمتوں کا زوال پذیر ہونا جان لیا تو اپنے لیے دنیا میں ایسی سلطنت مانگی جو چھن کر دوسرے کے پاس نہ جائے۔

یہ تاویل پہلی تین تاویلوں سے اس پہلو سے بالکل مختلف ہے کہ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے اپنے وجود کو وہ جسد قرار دیا گیا ہے جو آپ کی کرسی پر ڈالا گیا تھا۔

اس میں 'جسداً' کو مفعول کے بجائے حال مانا گیا ہے۔ زبان کے پہلو سے یہ بالکل ممکن ہے، لیکن اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں جو یہ خبر دی گئی ہے کہ آپ شدید بیمار ہوئے تھے حتیٰ کہ ایک بے جان لاشہ بن کر رہ گئے تھے۔ اس کے بارے میں ہمیں قرآن مجید، حدیث، بائیبل اور تاریخ سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ واقعہ بھی اسرائیلی قصے کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض اس تاویل پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں 'اناب' سے آپ کا حالت صحت کو لوٹنا مراد لیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا مفہوم رجوع الی اللہ بنتا ہے۔ بہر حال انابت کا جو بھی مفہوم لیا جائے یہی وہ عمل ہے جو بیماری کی حالت میں آپ نے کیا ہے۔ اگر اس سے آپ کا صحت یاب ہونا مراد لیا جائے تو پھر ظاہر ہے کہ 'قال رب اغفرلی' کے الفاظ جو آپ کی جانب سے انابت الی اللہ کے الفاظ ہیں، وہ بیماری کی حالت میں نہیں، بلکہ دوبارہ صحت حاصل ہونے کے بعد آپ کی زبان پر آئے ہیں، حالانکہ بیماری کی حالت میں انابت الی اللہ کا پیدا ہونا تو ایک عام مسلمان کے ہاں بھی بالکل فطری عمل ہے اور نبی کے ہاں تو ایسے مواقع پر بے مثل انابت ہوتی ہے، جیسے کہ ہم حضرت ایوب علیہ السلام کے ہاں دیکھتے ہیں، لیکن اس تاویل کے مطابق سلیمان علیہ السلام کا معاملہ کتنا عجیب ہے کہ آپ کو انتہائی شدید مرض لاحق ہے اور

آپ نے مغفرت کی دعا بھی کی تو اس وقت جبکہ اللہ نے صحت یاب کر دیا اور جب صحت یاب ہوئے تو استغفار کے ساتھ ساتھ نہ چھننے والی بے مثل بادشاہی کی دعا بھی مانگ ڈالی۔ یہ ساری تصویر کسی خشیت رکھنے والے بادشاہ کی بھی نظر نہیں آتی۔ کجا یہ کہ سلیمان علیہ السلام جو خدا کے برگزیدہ اور بڑے دانا پیغمبر تھے، ان کا معاملہ ایسا ہو۔ ان کے حوالے سے تو یہ ضروری تھا کہ ان کی جانب سے بیماری میں شاید انابت کا رویہ ظاہر ہوتا۔ پھر مزید یہ کہ اس کی تو کوئی وجہ ہی نہیں بنتی کہ آدمی بیماری سے اٹھتے ہی نہ چھن سکنے والی طاقت ور اور بے مثل بادشاہی کی دعائیں کرنے لگ پڑے۔ یہ رویہ تو سلیمان علیہ السلام کی شان ہی کے خلاف ہے۔ یہ تو کسی ایسے آدمی ہی کا رویہ ہو سکتا ہے جس کا دل دنیا میں اٹکا ہو۔ پس یہ تفسیر بھی اپنی ان کمزوریوں کی بنا پر قابل قبول نہیں رہتی۔

پانچویں رائے کا تجزیہ

پانچویں رائے جو ان آیات کی تاویل میں پیش کی گئی ہے، وہ امام رازی کی رائے ہے۔ اس میں انھوں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ بات بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خوف یا متوقع مصیبت کا احساس مسلط کر دیا ہو اور اس نے انھیں ایک بے جان لاشہ بنا دیا ہو۔

اس رائے کے مطابق سوالوں کے درج ذیل جواب سامنے آتے ہیں:

۱۔ جسد سے مراد خود حضرت سلیمان علیہ السلام کا وجود ہے۔

۲۔ کرسی پر ڈالنے سے مراد آپ کا شدید خوف کی بنا پر اپنی کرسی پر ایک بے جان دھڑ کی طرح پڑے رہنا ہے۔

۳۔ شدید خوف اور متوقع مصیبت وہ فتنہ تھا جس میں آپ ڈالے گئے۔

۴۔ اس موقع پر بے مثل بادشاہی کیوں مانگی گئی؟ اس سوال کا کوئی جواب سامنے نہیں آتا۔

اس رائے میں بھی چوتھی رائے کی طرح 'جسداً' سے مراد خود سلیمان علیہ السلام ہی ہیں یعنی آیت میں 'جسداً' حال واقع ہو رہا ہے۔ اس پر تو خیر کوئی بحث نہیں، البتہ یہ رائے امام رازی رحمہ اللہ نے اپنے قیاس سے پیش کی ہے۔

''تفسیر کبیر'' میں آپ کے الفاظ یہ ہیں:

اقول لا یبعد ایضاً ان یقال انه	''میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہ کہا
ابتلاء اللہ تعالیٰ بتسلیط خوف او	جائے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خوف یا متوقع مصیبت

توقع بلاء. کو غالب کر کے آپ کو آزمایا ہو۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ آیات کے اجمال کی کوئی واضح تفصیل نہیں کر رہے، بس ایک امکان ظاہر کر رہے ہیں جو درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔

دوسرا اعتراض اس رائے پر وہی ہے جو اس سے پچھلی رائے پر کیا گیا ہے کہ اس میں انابت سے مراد اللہ تعالیٰ کا آپ کے احوال کو درست کر دینا ہے۔ حالانکہ اگلی آیت میں سلیمان علیہ السلام کی اپنی انابت کا بیان ہے۔ اگر 'ثم اناب' سے اللہ تعالیٰ کا حالات کو درست کرنا مراد لیا جائے تو پھر 'قال رب اغفرلی' کے الفاظ دوران فتنہ میں آپ کے رویے کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ اس کے بعد آپ کے عمل کا بیان قرار پاتے ہیں۔

حالانکہ جیسے پچھلے صفحات میں بھی ذکر کیا گیا ہے، یہ ضروری ہے کہ یہ انابت دور فتنہ ہی میں ہو۔ جبکہ اس سے متصل قبل بھی سلیمان علیہ السلام کی انابت ہی کا ایک شان دار واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

تیسرا اعتراض بھی وہی ہے یعنی یہ کہ بے مثل بادشاہی ہی کی دعا کیوں مانگی گئی۔ یہ اس دعا کا کیا موقع و محل تھا۔ اس بات کا کوئی جواب ہمیں اس رائے میں نہیں ملتا۔

چنانچہ یہ رائے بھی اپنی ان خامیوں کی بنا پر قبول نہیں کی جا سکتی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے

دور حاضر میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں ان آیات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس پر اٹھنے والے سب سوالوں کا جواب دیا ہے۔ آپ کا طریقۂ تفسیر چونکہ روایتی تفاسیر سے بالکل مختلف[5] ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس رائے کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے ان آیات کا ترجمہ یہ کیا ہے:

''اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور ہم نے اس کے تخت پر ایک دھڑ کی طرح ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا۔ اس نے دعا کی: میرے رب، مجھے معاف فرما دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا

۵۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ قرآن مجید کی تفسیر میں قرآن کے اپنے الفاظ اور آیات کے نظم کو آخری درجے میں فیصلہ کن قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ متن کو شرح اور اصل کو فرع پر حاکم قرار دیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: مقدمۂ تفسیر ''تدبر قرآن'' از مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ۔

نہیں۔ تو بڑا ہی بخشنے والا ہے۔'' (تدبر قرآن ۶/۵۲۹-۵۳۰)

وہ اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں ان آیات کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انابت کا دوسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے[۶] .... تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ سخت امتحان پیش آیا کہ دشمنوں نے یورش کر کے ان کے بیش تر علاقے چھین لیے اور باقی علاقوں میں بھی ایسی گڑبڑ پھیلا دی کہ نظم حکومت عملاً بالکل درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ان کی تاخت سے صرف مرکز بچا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام بالکل مجبور و محصور ہو کر رہ گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امتحان تھا، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام ایک خدا ترس بادشاہ تھے، اس وجہ سے انھوں نے یہ گمان فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کسی غلطی کی سزا دی ہے۔ اس احساس نے ان کے غم کو دوبالا کر دیا اور وہ اس غم اور بے بسی کی حالت میں اپنے تخت حکومت پر ایک جسد بے جان ہو کر رہ گئے۔ اس وقت انھوں نے نہایت تضرع کے ساتھ اپنے رب سے دعا کی کہ اے رب، میرے گناہ معاف کر اور اگرچہ میں تیرے فضل و انعام کا حق دار نہیں رہ گیا ہوں، لیکن تو بڑا بخشنے والا ہے، اس وجہ سے میرے عدم استحقاق کے باوجود مجھے ایسی بادشاہی دے جس کے سزاوار اس طرح کے گناہ کے ساتھ دوسرے نہ ہوتے ہیں، نہ ہوں گے۔'' (۶/۵۳۳)

مولانا اصلاحی رحمہ اللہ اس اجمالی گفتگو کے بعد 'ولقد فتنا سلیمان' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی ہم نے سلیمان کو امتحان میں ڈالا۔ یہ امتحان اللہ کی سنت ہے۔ ضروری نہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی جرم ہی کی سزا کے طور پر امتحان میں ڈالے گئے ہوں۔ امتحان تمام نبیوں اور رسولوں کو پیش آئے ہیں جس سے ان کے صبر یا شکر کی آزمایش ہوئی ہے۔ اسی طرح کے ایک امتحان میں حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ڈالے گئے۔ اور چونکہ وہ ایک بادشاہ تھے، اس وجہ سے ان کو یہ امتحان ان کی بادشاہی کی راہ سے پیش آیا۔'' (تدبر قرآن ۶/۵۳۳-۵۳۴)

قرآن مجید نے سلیمان علیہ السلام پر آنے والے اس امتحان کو 'والقینا علی کرسیه جسداً' کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ کی شرح کرتے ہوئے مولانا اصلاحی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ نہایت مختصر، لیکن نہایت جامع لفظوں میں اس امتحان کا بیان ہے کہ کہاں تو وہ ایک وسیع الاطراف

۶۔ پہلا واقعہ ان آیات سے ماقبل کی متصل آیات میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعہ دراصل سلطنت کے کاموں میں آپ کی مشغولیت کی بنا پر نماز عصر قضا ہو جانے کے بعد آپ کی انابت کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

حکومت کے نہایت طاقت ور اور صاحب اقتدار بادشاہ تھے یا ہم نے ان کو ان کے تخت پر ایک بالکل جسد بے جان بنا کر ڈال دیا۔ لفظ 'جسد' یہاں بطور کنایہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بے بسی اور ان کے غم و الم کی تصویر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حکومت سمٹ سمٹا کر مرکز تک محدود رہ گئی اور حالات نے ان کو اس قدر بے بس اور غم زدہ بنا دیا کہ گویا صرف جسم رہ گیا، روح غائب ہو گئی۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایک بے بس اور غم زدہ بادشاہ کی جو اپنے مرکز میں محصور ہو کر رہ گیا ہو، اس سے بہتر تصویر نہیں ہو سکتی۔''

(تدبر قرآن ۶/۵۳۴)

سلیمان علیہ السلام خدا کے پیغمبر تھے۔ ان پر خدا کی طرف سے یہ مصیبت آئی تو انھوں نے اس موقع پر جو رویہ اختیار کیا، وہ واقعی ایک پیغمبر کا رویہ ہے۔ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے اسے 'ثم اناب' کی شرح کرتے ہوئے بیان کیا ہے:

''یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام ایسے حالات میں بھی اپنے رب سے مایوس نہیں ہوئے، بلکہ ان کو احساس ہوا کہ یہ ان کی کسی غلطی پر ان کی پکڑ ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اسی کی طرف توبہ و استغفار کے لیے متوجہ ہوئے۔''(تدبر قرآن ۶/۵۳۴)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

انابت کی اس حالت میں انھوں نے خدا سے کیا دعا کی مولانا اسے 'قال رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لا حد من بعدی، انک انت الوھاب' کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

''(اس نے دعا کی: میرے رب، مجھے معاف فرما دے اور مجھے ایسی سلطنت بخش جو میرے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں۔) اس دعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تو مجھے ایسی بادشاہی دے، جیسی بادشاہی میرے بعد کسی اور کو نہ ملے، بلکہ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگرچہ میں اپنے گناہ کے سبب سے کسی حکومت کا اہل تو نہیں رہ گیا ہوں، تاہم تو اپنے فضل سے مجھے ایسی بادشاہی دے جس کا سزاوار نہ میں ہوں، نہ میرے بعد کوئی اور ہو گا۔

.... تو بڑا بخشنے والا ہے، اس وجہ سے میں بھی اپنی غلطیوں کے باوجود امیدوار ہوں کہ تو مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔''(تدبر قرآن ۶/۵۳۴)

دعا میں موجود الفاظ 'لا ینبغی لاحد' کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دعا میں اصلی زور بادشاہی کی بے مثال عظمت و شوکت پر نہیں، بلکہ بلا استحقاق بادشاہی دیے جانے پر ہے کہ مجھے میرے گناہوں کے باوجود بادشاہی دے جبکہ میرے بعد کوئی اور اس کا سزاوار نہیں ٹھیرے گا۔

اس دعا میں اپنے گناہ کا جو شدید احساس ہے وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی غایت خشیت و انابت کی دلیل ہے۔''(تدبر قرآن ۶/ ۵۳۴)

مولانا اصلاحی کی رائے کا تجزیہ

تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو ان کے اقتدار کے حوالے سے آزمایش میں ڈالا۔ وہ اس آزمایش میں انتہائی بے بس و مجبور ہو گئے۔ انھوں نے ان حالات میں گھر جانے کو اپنی ہی کسی کوتاہی اور غلطی کا نتیجہ سمجھا، لیکن وہ ان حالات میں مایوس نہیں ہوئے، بلکہ پوری انابت کے ساتھ خدا کی طرف پلٹے، اس سے معافی مانگی اور اپنی غلطی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے اور خود کو کسی بادشاہی کا مستحق نہ گردانتے ہوئے بھی خدا سے محض اس کے فضل و کرم کی بنا پر اپنے لیے اقتدار کی دعا کی۔ اور اس سے وہ بادشاہی مانگی جو ان کے بعد کسی کو بھی ایسی صورت میں نہ ملنے والی ہو۔

اس تاویل کے مطابق آیات سے متعلق زیر بحث چار سوالوں کے جواب یہ بنتے ہیں:

۱۔ جسد سے مراد خود سلیمان علیہ السلام ہیں۔

۲۔ کرسی پر ڈالنے کا مطلب سلیمان علیہ السلام کا ملک میں اپنے اختیارات کے حوالے سے بے بس ہو جانا ہے۔

۳۔ اقتدار کو قائم رکھنے کے حوالے سے آپ کو جو مشکلات پیش آئیں، یہی وہ فتنہ اور آزمایش تھیں جس میں آپ مبتلا کیے گئے تھے۔

۴۔ چونکہ آپ کو اقتدار ہی کی راہ میں مشکلات پیش آئی تھیں، لہٰذا آپ نے مغفرت طلب کرنے کے بعد اس کے اسی فضل کے لیے دست سوال دراز کیا۔

ان جوابات کے حوالے سے اس تاویل پر غور کیا جائے تو بجا طور پر مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی یہ تاویل ایک پوری بات ہے۔ اس میں انھوں نے ان آیات کا جو مدعا بیان کیا ہے، وہ ایک طرف خدا کی اس حکمت کو بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے صالح بندوں کو آزماتا ہے تو دوسری طرف وہ اس شان نبوت کو سامنے لاتا ہے کہ انبیا پر جب آزمایش آتی ہے تو پھر ان کا رویہ کیا ہوتا ہے، ان کے ہاں پھر عجز و انکسار کے کیا رنگ نمودار ہوتے ہیں اور خدا کے ساتھ ان کے تعلق کی شدت کیسی نیازمندی میں ڈھلتی ہے۔

پچھلی ساری بحث کے تناظر میں، اگر ہم مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی اس تاویل کا دقت نظر سے مطالعہ کریں تو

یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ وہ واحد تاویل ہے جو قرآن مجید کے اس مشکل مقام کو واضح طور پر حل کر دیتی ہے اور اس پر اس نوعیت کے اعتراض بھی وارد نہیں ہوتے جو اس کے علاوہ دوسری تاویلات پر وارد ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیے، ان پر ایک اعتراض یہ تھا کہ ان میں سے بعض تاویلات[۷] میں قرآن مجید کے اپنے الفاظ کی صحیح رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی۔ جبکہ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے ان آیات کا جو مفہوم بیان کیا ہے، اس میں افعال کے باہم عطف و معطوف کا معاملہ ہو، 'جسداً' کے لفظ کی بحث ہو یا 'اناب' کے مفہوم کا بیان، ہر حرف اور ہر لفظ ٹھیک اپنے مدعا ہی کو بیان کر رہا ہے۔ چنانچہ دیکھیے 'ولقد فتنا سلیمان' میں فتنہ کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا بتاتے ہیں کہ یہ امتحان اللہ کی سنت ہے۔ تمام نبیوں اور رسولوں کو امتحان پیش آئے ہیں، چنانچہ ضروری نہیں کہ حضرت سلیمان کسی جرم ہی کی سزا کے طور پر امتحان میں ڈالے گئے ہوں، یعنی دوسری تاویلات میں فتنہ ہی کے لفظ کی وضاحت میں جس طرح کی رکیک باتیں سلیمان علیہ السلام سے منسوب کی گئیں، مولانا نے ان سب کی یکسر نفی کر دی اور یہ بتایا کہ یہ تو خدا کا طریقہ ہے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کو آزماتا ہے۔ اس کے بعد 'القینا علی کرسیه جسداً' کے تحت آپ نے اس القا کو اس فتنے کا بیان قرار دیا ہے جس میں سلیمان علیہ السلام ڈالے گئے تھے۔ جبکہ دوسری اکثر تاویلات میں اسے کسی آزمایش میں ناکام ہونے پر خدا کی طرف سے دی جانے والی سزا قرار دیا گیا ہے، حالانکہ یہ دوسرا جملہ واضح طور پر پہلے جملے 'ولقد فتنا سلیمان' کا بیان ہے۔ 'ثم اناب' کے الفاظ سے مولانا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی انابت مراد لی ہے جبکہ بعض دوسری تاویلات میں اسے خدا کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت ۳۵ یعنی 'قال رب اغفرلی وهب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی' کے دونوں جملوں کو مولانا نے انابت ہی کی تفصیل قرار دیا ہے۔ آیت کو دیکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسے 'ثم اناب' کی تفصیل ہونا چاہیے، البتہ 'وهب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی' کا ٹکڑا کیسے اناب کی تفصیل قرار پا سکتا ہے، فہم کے پہلو سے اس میں ضرور مشکل محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دوسرے مفسر نے اسے 'اناب' کی تفصیل قرار نہیں دیا،[۸] لیکن مولانا

۷۔ دیکھیے، دوسری اور تیسری تاویل کے تجزیے میں 'فتنا' اور 'القینا' کے باہم عطف و معطوف ہونے کی بحث، پہلی تاویل کے تجزیے میں 'جسداً' کے لفظ پر بحث اور چوتھی اور پانچویں تاویل میں 'اناب' کے لفظ پر بحث۔

۸۔ آیت کے اس ٹکڑے سے عموماً سات باتیں مراد لی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنے لیے معجزہ طلب کیا۔ دوسری یہ کہ انھوں نے ایسی سلطنت کو اپنے ساتھ اس لیے خاص کیا کہ آپ کے خیال میں آپ تو اسے سنبھال سکتے

اصلاحی رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ یہ خدا سے مغفرت طلب کرنے کے بعد کسی دنیوی جاہ و حشمت کی حرص کا اظہار نہیں، بلکہ یہ بھی ایک منکسر عاجز نبی کا خدا کے در سخاوت پر دستک دینا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس دعا کا یہ مطلب نہیں کہ تو مجھے ایسی بادشاہی دے جیسی بادشاہی میرے بعد کسی اور کو نہ ملے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگرچہ میں اپنے گناہ کے سبب سے کسی حکومت کا اہل تو نہیں رہ گیا ہوں، تاہم تو اپنے فضل سے مجھے ایسی بادشاہی دے جس کا سزاوار نہ میں ہوں نہ میرے بعد کوئی اور ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس دعا میں اصلی زور بادشاہی کی بے مثال عظمت و شوکت پر نہیں، بلکہ بلا استحقاق بادشاہی دیے جانے پر ہے کہ مجھے میرے گناہوں کے باوجود بادشاہی دے اور ایسی بادشاہی جس کا میرے بعد کوئی اور سزاوار نہیں ٹھیرے گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس دعا میں اپنے گناہ کا جو شدید احساس ہے، وہ حضرت سلیمان کی غایت خشیت و انابت کی دلیل ہے۔ خشیت و انابت کے بھی کئی درجات ہیں۔ ان درجات میں یہ مقام بھی آتا ہے جب توبہ و انابت کرنے والا خدا کے ساتھ قرب و تعلق کی وہ منزلیں طے کر لیتا اور اس کے سامنے عجز و تذلل اختیار کرنے میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کے اپنے ہاں احساس خطا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے اعتمادی اعتماد میں بدلتی اور ہچکچاہٹ اقدام میں ڈھلتی ہے۔ بندے میں اس سارے انقلاب کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پوری ذات کو بالکل خدا کے قدموں میں لا کر ڈال دیتا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس خداے فیاض کے سامنے اس کا کوئی بندہ جب یوں سارے دل اور ساری روح کے ساتھ آن کھڑا ہوتا ہے تو پھر اس کے در رحمت سے پہلی عطا جو اسے ملتی ہے وہ اپنی ذات پر اعتماد و یقین اور ہچکچاہٹ کے بجائے اقدام کی یہ دولت ہے۔ پھر خدا اس کے دل میں احساس ندامت کے بجائے یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ وہ خدا کا ہے اور خدا اس کا ہے۔ چنانچہ پھر محتاج اپنے داتا سے مانگتا اور فقیر اپنے غنی سے سوال کرتا ہے۔ وہ سوال جو اس کے دل میں آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ نے 'ھب لی ملکا لا ینبغی لا حد من بعدی' کی جو وضاحت کر دی ہے، بس اس سے آیت

تھے اور دوسروں کے بس کی یہ چیز نہ تھی۔ تیسری یہ کہ آپ نے چاہا کہ پہلے کی طرح مجھ سے کوئی سلطنت چھین نہ سکے۔ چوتھی یہ کہ آپ نے چاہا کہ آپ کو دنیا اپنی آخری حد تک حاصل ہو جائے تاکہ آپ کا دل اس کے لیے کبھی بھی نہ ترسے۔ پانچویں یہ کہ آپ لوگوں کے لیے اتنے بڑے اقتدار کے ساتھ بہترین اسوہ بنیں۔ چھٹی یہ کہ آپ اپنی فضیلت کے خواہاں تھے۔ ساتویں یہ کہ مرض سے شفایاب ہونے کے بعد آپ نے جب یہ جان لیا کہ دنیا کی نعمتیں زوال پذیر ہیں تو خدا سے اپنے لیے لازوال بادشاہی مانگی۔

کا یہ حصہ بھی 'ثم اناب' ہی کی تفصیل قرار پاتا ہے، ورنہ اس کے فہم میں علما بہت کوشش کے باوجود بھی یہ گوہر مقصود نہ پا سکے تھے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں کہ سابقہ تاویلات میں سے بعض[9] تاویلات پر یہ شدید اعتراض پیدا ہوتا تھا کہ ان سے اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام کی شان نبوت شدید مجروح ہوتی ہے، لیکن اس کے برعکس مولانا کی یہ تاویل حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان نبوت کو پوری قوت سے سامنے لاتی ہے۔ چنانچہ دیکھیے، اس تاویل کی ابتدا ہی میں مولانا فرماتے ہیں کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انابت کا دوسرا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ان آیات کی ساری شرح جو انھوں نے بیان کی ہے، وہ واقعتہً حضرت سلیمان علیہ السلام کی انابت ہی کی داستان ہے۔ پھر اپنی ساری تاویل بیان کرنے کے بعد حضرت سلیمان کی دعا کو بھی جس خاص زاویے سے آپ نے سمجھا اور بیان کیا ہے، اس سے بھی حضرت سلیمان کی غایت خشیت و انابت ہی کا اظہار ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ شدید خشیت و انابت ہی پیغمبر کی اصل شان ہوتی ہے۔

چنانچہ حضرت سلیمان کی شان نبوت کا یہ اظہار مولانا کی اس تاویل کی دوسری بڑی خوبی ہے۔ سابقہ تاویلات میں سے بعض[10] تاویلات پر یہ اعتراض ہوا تھا کہ ان میں بیان کردہ مضمون ماقبل اور مابعد کی آیات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس حوالے سے آپ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی تاویل کو دیکھیے تو یہ ماقبل اور مابعد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ سورۂ ص میں یہ سلسلۂ کلام دراصل متعدد انبیا کی اوابیت اور ان کی انابت کا بیان ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے ان آیات سے ماقبل سلیمان علیہ السلام ہی کی انابت کا ایک اور واقعہ بیان ہوا ہے، جس میں آپ کے جہاد کے گھوڑوں کا معاینہ کرتے ہوئے نماز عصر کے قضا ہو جانے اور شدید تاثر کی حالت میں آپ کے گھوڑوں پر تلوار چلانے کا ذکر ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس واقعے کو اور زیر بحث آیات میں بیان کردہ واقعے کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی میں آنے والے انابت و اوابیت کے دو یادگار واقعات کے طور پر لیا ہے۔ ماقبل کی آیات سے تو آپ ان آیات کو اس طرح سے مربوط کرتے ہیں اور مابعد کی آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا اور جنات کے تسخیر کر دیے جانے کا ذکر ہے، ان کی شرح کرتے

۹۔ دیکھیے، پہلی تاویل پر امام رازی کی تنقید حاشیہ ۴ میں اور تیسری تاویل کے تجزیے میں مولانا مودودی کی متعلقہ حدیث پر درایت کے حوالے سے تنقید۔

۱۰۔ دیکھیے، پہلی اور دوسری تاویل کا تجزیہ۔

ہوئے آپ بتاتے ہیں کہ مذکورہ بالا امتحان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام پر آپ کی دعا کے نتیجے میں اللہ کا یہ فضل ہوا کہ اس نے آپ کو ہوا اور جنات پر کنٹرول بخشا۔ چنانچہ آپ کی یہ بیان کردہ تاویل ماقبل و مابعد کی آیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ اس تاویل کی تیسری خوبی ہے۔

اس کے بعد آپ یہ دیکھیں کہ سابقہ تاویلات میں سے بعض [11] تاویلات محض بے بنیاد قصے کہانیوں پر مشتمل روایات پر مبنی ہیں، لیکن اس کے برعکس مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی بیان کردہ یہ تاویل ایک تاریخی واقعے پر مبنی ہے۔ بائیبل میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

”اور خداوند نے سلیمان کا ایک مخالف برپا کیا۔ ہدد ادومی جو ادوم کے بادشاہوں کی نسل سے تھا... اور خداوند نے سلیمان کا ایک دوسرا مخالف رزون بن الی یاداع برپا کیا۔ وہ اپنے آقا صوبہ کے بادشاہ ہدد عزر سے بھاگا تھا۔ تو اس کے پاس آدمی جمع ہوئے اور وہ ڈاکوؤں کا سردار بنا۔ جس وقت کہ داؤد نے ان کو ہلاک کیا تو وہ دمشق کو گئے اور وہاں رہے اور انھوں نے اس کو دمشق میں بادشاہ بنایا اور وہ ہدد کی شرارت سے بڑھ کر سلیمان کے سارے ایام میں اسرائیل کا مخالف رہا اور اس نے اسرائیل سے نفرت کی اور ادوام کا حاکم رہا۔“

(کلام مقدس ا۔ ملوک ۱۱: ۱۴، ۲۳-۲۵)

کلام مقدس (بائیبل) کی ان آیات میں سلیمان علیہ السلام کے خلاف یورش برپا کرنے والوں کا ذکر جس طرح سے کیا گیا ہے، وہ خاص طور پر قابل غور ہے، یعنی خود خداوند نے سلیمان کے دو مخالف برپا کیے۔ یہ الفاظ بالکل واضح طور پر 'ولقد فتنا سلیمان' کی شرح کرتے ہیں۔ سلیمان علیہ السلام کے مخالفین نے جن علاقوں میں یورش برپا کی تھی وہ کتنی شدید تھی، کب وہ کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی اور کب اس کو کنٹرول کر لیا گیا، اس کی تفصیل گو یہود کے ہاں پوری طرح محفوظ نہیں رہی، لیکن اسرائیلی تاریخ سے انھیں پیش آنے والی مشکلات کا ایک حد تک اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔

John Bright اپنی کتاب ”A History of Israel“ میں ”سلیمان اور اس کی سلطنت“ کے زیر عنوان یہ لکھتا ہے کہ: ہداد نے سلیمان کے لیے ایک عرصہ تک یورش برپا کیے رکھی اور اس نے کچھ عرصہ کے لیے بعض علاقے اسرائیلیوں سے چھین بھی لیے۔ شام کے اندر سلیمان کے لیے صورت حال زیادہ تشویش ناک تھی، رزون نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دمشق پر قبضہ کر لیا اور وہاں کا حکمران بن گیا، اس نے سلیمان کی

۱۱۔ دیکھیے، پہلی، دوسری اور چوتھی تاویل کا تجزیہ۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پوزیشن کو شدید نقصان پہنچایا۔ ہم پر یہ بات واضح نہیں ہے کہ اس کے جواب میں سلیمان نے کیا کیا اقدامات کیے اور ہم یہ بھی تعیین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس دور کی بات ہے، اسی طرح سلیمان کو شام میں پہنچنے والے نقصانات کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں ہے۔

بائیبل اور یہ اسرائیلی تاریخ گو اس صورت حال کی تفصیلات تو ہمارے سامنے نہیں رکھتی، مگر قرآن مجید کے اس اجمال کی تفصیل کے لیے ہمارے سامنے وہ خاطر خواہ مواد ضرور رکھ دیتی ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سلیمان علیہ السلام اپنے دور حکومت میں اقتدار کے حوالے سے بعض سنگین مشکلات کا شکار ہوئے تھے۔

چنانچہ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی اس تاویل کی یہ چوتھی خوبی ہے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔

بلاشبہ مولانا اصلاحی رحمہ اللہ کی اس تاویل کی ان امتیازی خوبیوں کی بنا پر اس کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ وہ واحد تاویل ہے جو سورۂ ص کی زیر بحث آیات کے مدعا کو واضح طور پر بیان کر دیتی ہے۔ هذا ما عندی والعلم عند الله۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد بلوچ

جناب عبد الستار غوری سے ایک مکالمہ

''ملاقات'' کے اس سلسلے کا مقصد قارئینِ ''اشراق'' کو اہم شخصیات کے خیالات سے انھی کی زبانی آگاہ کرنا اور دین پر غور و فکر کے دوسرے زاویوں سے باخبر رکھنا ہے تاکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اور بغیر کسی تعصب کے مذہبی آرا کی صحت اور عدمِ صحت کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ان شخصیات کے خیالات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مدیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محقق عالم قصرِ علم میں بنیاد کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، مگر بنیاد کا المیہ یہ ہے کہ وہ عمارت کا بوجھ اٹھائے ہمیشہ نظروں سے اوجھل زیرِ زمین رہتی ہے۔ اسی طرح محققین بھی قصرِ علم کے کلس پر چمکنے والی سنہری کلغی کے بجائے پیچیدہ اور ثقیل تحریروں کی اوٹ میں چھپے رہتے ہیں۔ جناب عبد الستار غوری بھی ایک محقق عالم ہیں۔ وہ معہد العلم الاسلامی، المورد سے وابستہ ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بائیبل میں موجود پیشین گوئیوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ تحقیق جس قدر اہمیت رکھتی ہے وہ اسی قدر خاموشی اور گوشہ نشینی سے اس میں منہمک ہیں۔

غوری صاحب مشرقی پنجاب کے ایک شہر پٹیالہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد جھنگ میں سکونت اختیار کی اور وہیں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور معلم کیا اور ایم اے۔ بی ایڈ کرنے کے بعد ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور اسی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا، لیکن شعوری طور پر دین کو جاننے کا عمل مولانا ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کی تحریروں سے شروع ہوا۔ وہ

جلد ہی جماعتِ اسلامی کے گرویدہ ہو گئے اور ۱۹۵۲ سے ۱۹۵۵ تک جھنگ شہر اور ۱۹۵۶ سے ۱۹۵۸ تک گوجرانوالہ میں جماعتِ اسلامی کے فعال کارکن رہے۔ جب ۱۹۵۸ میں قومی اسمبلی کی بساط لپیٹ کر پہلا مارشل لا نافذ ہوا اور سیاسی ہنگاموں میں کمی ہوئی تو غوری صاحب دینی تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ محض اس لیے مسلمان ہیں کہ ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا ہے۔ اگر وہ کسی غیر مسلم کے ہاں پروان چڑھتے تو کبھی مسلمان نہ ہوتے۔ اس سوچ نے انھیں مجبور کیا کہ وہ دینِ اسلام کی عقلی بنیادوں سے واقف ہوں۔ اس جستجو نے انھیں بائیبل کے مطالعے کی طرف راغب کیا۔ اب جبکہ وہ گزشتہ دو برسوں سے اپنا تمام وقت اسی کام میں صرف کیے ہوئے ہیں، ہم نے ''اشراق'' کے قارئین کے لیے ان کی اس جستجو اور تحقیق کے حوالے سے گفتگو کا اہتمام کیا۔ اس گفتگو میں راقم کے علاوہ طالب محسن صاحب اور محمد بلال صاحب بھی شریک تھے۔

ہم نے رسمی گفتگو کے بعد دریافت کیا کہ انھوں نے بائیبل ہی کو اس کام کے لیے کیوں منتخب کیا تو وہ گویا ہوئے:

''میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ پیغمبرِ اسلام واقعی اللہ کے رسول ہیں تو قرآن اور اس کے مندرجات کی حقانیت واضح ہو جائے گی کیونکہ دینِ اسلام کا محور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ میں صرف اسی صورت میں یہ کہہ سکوں گا کہ دینِ اسلام کو میں نے وراثت ہی میں نہیں پایا بلکہ اسے حقیقت جان کر اختیار کیا ہے۔ جب قرآن کو اس نظر سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سابق انبیا کے برعکس یہاں معجزے کو دلیلِ نبوت کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ اس ضمن میں کفار کے مطالبے کو رد کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہونے کے وجہ سے دوامی پیغمبر ہیں، جبکہ معجزہ تو محض دیکھنے والوں کے لیے دلیل ہو سکتا ہے اسی لیے آنحضرت کو حسی معجزات نہیں دیے گئے۔ اس کے بجائے قرآن نے ایک تو پیغمبرِ اسلام کی ذات کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ ان کے اندر پائی جانے والی خصوصیات صرف ایک پیغمبر ہی میں ہو سکتی ہیں۔ دوسری دلیل کی حیثیت سے خود قرآن کو پیش کیا گیا کہ یہ کلام کسی بشر کا نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں دلیلوں کی وضاحت ہمارے مسلمان علمانے بہت عمدہ طریقے سے کی ہے اور اس ضمن میں بڑا قابلِ قدر کام ہوا ہے۔ اس طرح کے لٹریچر میں ایک مسلمان کے لیے تو بلاشبہ بہت اپیل ہے، مگر ایک غیر مسلم کے نزدیک اس کی حیثیت مختلف ہے۔ چنانچہ ان دو دلائل کے علاوہ قرآن نے ایک تیسری دلیل بھی پیغمبرِ اسلام کی رسالت کے ضمن میں بڑی تحدی کے ساتھ پیش کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب آپ کو اپنی کتابوں میں واضح

طور پر لکھا ہوا پاتے ہیں اور اس حوالے سے وہ آپ کو یوں پہچانتے ہیں جیسے کوئی باپ اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر دلائل و شواہد سے یہ بات ثابت ہو جائے تو موجبِ اطمینان ہو گا۔ بھلا کوئی شخص اپنے پیدا ہونے سے کئی سو سال پہلے بطور نبی مبعوث ہونے کی پیش گوئی کیسے کر سکتا ہے۔ یہ بات نہ صرف قرآن اور پیغمبرِ اسلام کی صداقت کی دلیل ہو گی بلکہ جس کتاب میں یہ بیان ہوئی ہے اس میں کلامِ الٰہی کے موجود ہونے کی بھی دلیلِ محکم ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے آپ کو دوسری کتابوں کا مصدق یعنی تصدیق کرنے والا قرار دیا ہے۔''

اس موقع پر طالب محسن صاحب نے موضوع کا رخ بدلتے ہوئے سوال کیا: ''آپ نے ایک بھرپور مذہبی زندگی گزاری ہے یہ بتائیں کہ وہ کیا چیز ہے جس سے آدمی نیکی پر قائم رہتا ہے؟''

غوری صاحب نے کچھ لمحوں کے لیے توقف کیا اور گویا ہوئے: ''اس میں ایک چیز تو قرآنِ مجید کا مطالعہ ہے اور دوسری نیک لوگوں کی صحبت۔ اگر فی الواقع کسی سچے مسلمان کی صحبت نصیب ہو جائے تو یہ ایک بڑی نعمت ہے۔ کسی زمانے میں، میں اس تلاش میں رہا اور اس دوران میں متعدد لوگوں سے فیضِ صحبت حاصل ہوا۔ اخلاص و تقویٰ میں مجھ پر سب سے زیادہ گہرا اثر جامع محمدی شریف جھنگ کے بانی مولانا محمد ذاکر اور وزیر آباد کے ایک گمنام بزرگ حکیم محمد عبد اللہ کا ہوا۔ مولانا اللہ یار خان آف چکڑالہ کی صحبت بھی نصیب ہوئی۔ ان کی محفل میں ''ذکر'' بہت اہتمام سے کیا جاتا اور اس میں لطف بھی بڑا آتا۔ اس دوران میں تہجد بھی خوب پڑھتا۔ اور اس میں بڑا انہماک ہوتا مگر یہ خلش بھی ذہن میں مسلسل رہی کہ اگر اس طرح کا ذکر کوئی مطلوب و محبوب چیز ہوتی تو ہمارے پیارے نبی نہ صرف اس کی تعلیم دیتے بلکہ اس کی تعلیم پر بہت زور بھی دیتے۔ پھر دوسری خلش یہ محسوس کی کہ اس لطف اور لذت کا انسان کے عمل اور کردار پر اثر کیوں نہیں پڑتا۔''

یہ انکشاف بظاہر بڑا حیران کن تھا۔ میں نے اس اجمال کی مزید وضاحت مناسب خیال کی اور پوچھا: ''آپ لطف و لذت اور انسان کے عمل و کردار کا آپس میں تعلق کیسے پیدا کرتے ہیں؟''

''اس لطف و سرور نے میرے کردار اور عمل میں کوئی بہتری پیدا نہیں کی۔ میرے اندر اگر کوئی نیکی تھی تو وہ پہلے سے موجود تھی، اس ذکر نے اس میں کسی قسم کا کوئی اضافہ یا نکھار پیدا نہیں کیا۔''

غوری صاحب کی یہ وضاحت اگرچہ کافی تھی لیکن معاملے کو دو اور دو چار کی طرح واضح کرنے کے لیے میں نے کہا: ''جس طرح نماز کے بارے میں قرآن کا فرمان ہے کہ: 'ان الصلوٰۃ تنهى عن الفحشا

والمنکر' اس حوالے سے آپ ذکر کے متعلق نہیں کہہ سکتے کہ 'ان الذکر ینھی عن الفحشا والمنکر'۔''

غوری صاحب ہماری بات کی تصدیق کرتے ہوئے بولے: ''جی ہاں، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس ذکر میں لذت اور سرور بہت تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ قرآن نے نماز کو بھی ذکر کہا ہے اور نماز کا یہ مقصود و منتہا قرار دیا ہے کہ اس سے انسان کے دل میں اللہ کی یاد تازہ رہتی ہے۔''

لذت اور سرور کے لفظوں میں چھپی ہوئی پُراسراریت نے ہمیں متجسس کر دیا تو ہم غوری صاحب سے ان کا مفہوم بتانے کی فرمائش کر بیٹھے۔ جواب میں انھوں نے ایک دل آویز قہقہہ لگایا اور کہا: ''بھلا اس کیفیت کو میں الفاظ میں کیسے بیان کروں۔'' میں نے اپنی پریشانی کی وجہ بیان کرتے ہوئے عرض کی کہ دراصل جو آدمی دین کو جدید طرز پر جاننے اور کہنے کا عادی ہے، اس کا معاملہ تو دوسرا ہے لیکن جو شخص روایتی ذہن اور عام علمی پس منظر رکھتا ہے وہ اسی سرور اور لذت کے حصول کو حق کا معیار سمجھے گا اور پھر اس عبادت اور مشغلے کو عین دین خیال کرے گا جس سے اسے لذت ملتی ہو گی، اس وجہ سے میں ان کیفیات کی حقیقت کو واضح کرنا بہت اہم سمجھتا ہوں۔

غوری صاحب بولے: ''یہ بالکل درست بات ہے کہ لوگ اس لذت اور سرور کو حق کا معیار اور دین میں مطلوب سمجھتے ہیں اور اس لیے اس طرح کے حلقوں میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ مگر میں اپنی بات کر رہا تھا کہ میں نے تو اس وجہ سے اس حلقے کو خیر باد کہا کہ مجھے حدیث و سنت میں اس کی کوئی دلیل نہ مل سکی۔ باقی رہا معاملہ لذت و سرور کا، تو یہ ایک سنجیدہ اور ذی شعور انسان کا مقصدِ حیات نہیں بن سکتا۔ وہ تو عرصۂ حیات کے ایک ایک لمحے کو اللہ کی امانت اور اس کے متعلق اپنے آپ کو اللہ کی بارگاہ میں جواب دہ سمجھتا ہے۔ لذت و سرور کو اگر دینی تجربے کا مقصد قرار دے لیا جائے تو یوگا، تپیسا اور رقص و موسیقی عین دین قرار پائیں گے، جیسا کہ بعض مذاہب نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔''

طالب محسن صاحب نے ایک مرتبہ پھر غوری صاحب کے ماضی کو آواز دی اور پوچھا: ''یقیناً آپ کا واسطہ ہر مذہبی حلقے سے رہا ہو گا، اس حوالے سے بتائیے کہ آپ نے مقابلتاً کس طرح کے لوگوں کو بہتر پایا؟''

جماعت اسلامی کے ساتھ کام کرتے ہوئے میرا احساس یہی رہا ہے کہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے یہ لوگ معاشرے کے بہتر لوگ ہیں۔ میرا عام علما سے بھی خاصا رابطہ رہا ہے، میں خود بھی سالہا سال تک جمعے کا خطبہ دیتا

رہا ہوں، لیکن علما کے طبقے نے مجھ پر زیادہ اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ بعض بہت اعلیٰ کردار کے تھے، لیکن اکثریت میں ایک طرح کا پیشہ وارانہ رویہ دیکھنے کو ملتا تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں جماعتِ اسلامی کے ہاں ایک بے غرض، ایمان دار اور بے لوث سچائی دیکھنے کو ملتی۔ مثلاً ایک دفعہ ایک سفر کے دوران میں راستے میں میری جیب کٹ گئی یا پیسے کھو گئے۔ اب میرے پاس واپسی کا کرایہ نہیں تھا۔ مجھے تقریباً ۲۰ کلو میٹر کے فاصلے پر جانا تھا، کرایہ چند آنے تھا۔ میں گاڑی پر بغیر ٹکٹ ہی کے بیٹھ گیا اور اسٹیشن پر اتر گیا۔ وہاں جا کر میں نے جماعت کے مقامی امیر مولانا محمد یعقوب ندوی سے اس واقعے کا ذکر کیا تو انھوں نے حکم دیا کہ میں نے جو سفر کیا ہے اس کا ٹکٹ خرید کر اسے پھاڑ دوں۔ یہ تھا ان لوگوں کے ہاں ایمان داری، ذمہ داری اور اقدار کی پاس داری کا حال۔ لیکن آج جماعت کی کیا صورتِ حال ہے، اس کے متعلق میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اب میرا جماعت سے کوئی عملی تعلق نہیں۔

غوری صاحب خاموش ہو گئے تو ہم نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات کے متعلق گفتگو کو غیر ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ ان کے زیرِ تحقیق موضوع پر دوبارہ بات شروع ہوئی تو وہ کہنے لگے:

''اہلِ اسلام قرآن کو جس طرح سے منزل من اللہ جانتے ہیں، اہلِ کتاب بائیبل کو اس طرح نہیں مانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ بائبل میں موجودہ حالت میں کلامِ الٰہی بھی موجود ہے اور تحریفات اور اضافے بھی۔ بائیبل کے تقریباً تمام ذمہ دار علما و مفسرین یہ بات تسلیم کرتے ہیں۔ بائیبل کے متعلق قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ من وعن صحیح ہے۔ جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بائیبل نے پیغمبرِ اسلام کے متعلق نہایت واضح پیشین گوئیاں بیان کی ہیں۔

ظاہر ہے اس طرح کی حقیقت کو بے نقاب کرنا یا اسے دریافت کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بطور مسلمان ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے دائرۂ اثر اور استعداد کی حد تک اسلام کا پیغام پہنچائیں، وہ اسے مانیں یا نہ مانیں، ان کی مرضی، لیکن اگر غیر مسلم امتِ مسلمہ کی غفلت کے باعث اسلام سے دور اور بیگانے رہتے ہیں تو یقیناً ہم گناہ گار ٹھیرتے ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے مناسب خیال کیا کہ کیوں نہ قرآن کے اس دعوے کے متعلق تحقیق کی جائے کہ 'یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم' اور سچی بات یہ ہے کہ اگر بائیبل میں موجود پیغمبرِ اسلام کے متعلق پیشین گوئیوں کو نہ مانا جائے تو خود ان صحائف کی تکذیب ہو جائے گی۔ کیونکہ ان میں بیان کی ہوئی پیشین گوئی کے مطابق وہ ''نبی'' نہیں آیا، تو یہ پیشین گوئی اور اسے بیان کرنے

والی کتاب جھوٹی قرار پاتی ہے۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ آپ جس شد و مد کے ساتھ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ بائیبل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں اس صراحت سے بیان ہوئی ہیں تو کیا اہلِ کتاب کو یہ نظر نہیں آتیں؟''

غوری صاحب قدرے توقف کے بعد بولے ''دراصل ہمارے علما نے اس موضوع پر کبھی تحقیقی انداز اپنایا ہی نہیں، وہ اسے مناظرانہ طریقے سے سامنے لاتے ہیں اور مناظرے میں فتح حاصل ہو بھی جائے تو اس سے آپ مخاطب کا دل نہیں جیت سکتے!''

بلال صاحب نے کہا: ''احمد دیدات صاحب کا نام اس ضمن میں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے وہ بائیبل کے بہت بڑے عالم کے طور پر مشہور ہیں، ان کے کام کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''

غوری صاحب بولے: ''احمد دیدات بھی اگرچہ کثیر المطالعہ، ذہین اور حاضر جواب صاحبِ علم ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ ایک مناظر ہیں۔''

غوری صاحب چند لمحوں کے لیے پھر رکے: ''اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں صراحت کے ساتھ موجود ہونے کے باوجود اہلِ کتاب انھیں تسلیم کیوں نہیں کرتے تو اس کی ایک وجہ تو جہالت، تعصب اور بے اعتنائی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسلم علمانے تحقیق و تبلیغ کا حق ادا نہیں کیا۔''

اس موقع پر ہم نے سوال کیا: ''قرآن میں تصریح ہے کہ اہلِ کتاب نے اپنی کتب میں تحریف کی، جبکہ عیسائی یہ بات تسلیم نہیں کرتے۔ اس بارے میں کچھ بتائیے؟''

یہ بات تو صرف یہاں کے عیسائی کرتے ہیں کہ بائیبل میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہے، ورنہ آپ بائیبل کی انگریزی کی کوئی تفسیر یا حواشی اٹھا کر دیکھ لیں، ہر ایک میں لکھا ہو گا کہ یہ کتاب معلوم نہیں کہاں سے آگئی، یہ بات اضافی ہے اور یہ سطر بدل دی گئی ہے، اس پیرے میں ان الفاظ کی کمی کر دی گئی ہے۔ یعنی وہ ہر قسم کی تحریف کو مانتے ہیں۔ یوں یہ بات ہرگز متنازع نہیں کہ بائیبل میں تحریف ہوئی ہے۔''

اس موقع پر ہمیں مناسب معلوم ہوا کہ بائیبل کا تاریخی پس منظر سامنے آجائے۔ غوری صاحب نے بھی اس موضوع کی افادیت محسوس کی اور گویا ہوئے:

''بائیبل کے دو حصے ہیں ایک عہد نامۂ عتیق (Old Testament) اور دوسرا عہد نامۂ جدید

(New Testament)۔ پہلے حصے کی اصل زبان عبرانی (Hebrew) ہے اور دوسرے کی یونانی (Greek) پہلے حصے میں ۳۹ کتابیں ہیں اور ان کی تصنیفی تاریخ کہ وہ کب اور کیسے معرضِ وجود میں آئیں، اس کے متعلق کوئی بھی محقق یا مفسر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ کب لکھی گئیں، کس نے لکھیں اور ان کو مدون کس نے کیا۔ البتہ ۵۸۶ ق م میں بخت نصر کے یروشلم پر حملے سے پہلے اس کا بڑا حصہ موجود تھا۔ اور تیسری صدی قبل مسیح میں اس کا یونانی زبان میں ترجمہ بھی مکمل ہو چکا تھا جسے انگریزی میں 'Septuagint' اور اردو میں ہفتاوی ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ یوں اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے اڑھائی تین سو سال قبل عہد نامۂ قدیم کی کتب معرضِ تحریر میں آ چکی تھیں۔ جن میں بعض ضعیف درجے کی کتب (Apocrypha) بھی موجود تھیں۔

بائبل کے دوسرے حصے یعنی عہد نامۂ جدید میں ستائیس کتب و مکاتیب وغیرہ شامل ہیں ان کے زمانۂ تصنیف کے متعلق متعین طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ دوسری صدی عیسوی میں ان کا موجود ہونا کافی حد تک قرینِ قیاس ہے۔ اس کی پہلی چار کتب چار مختلف انجیلوں پر مشتمل ہیں جن کے مرتبین اور زمانۂ تدوین کے متعلق بھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ ۷۰ء اور ۱۲۰ء کے درمیان مختلف اوقات میں منصۂ شہود پر آئیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تمام کتب ابتدا ہی میں یونانی زبان میں لکھی گئیں۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان آرامی (Aramaic) تھی اور حضرت مسیح علیہ السلام نے اللہ کا پیغام یونانی میں نہیں بلکہ آرامی زبان میں لوگوں تک پہنچایا تھا۔ گویا یہ اناجیل اپنی اصلی زبان میں سرے سے کبھی لکھی ہی نہیں گئیں۔''

بائبل کے اس تعارف کے بعد طالب محسن صاحب نے سوال کیا:

''آپ نے بائبل میں کتنی پیشین گوئیوں کو متعین کیا ہے؟''

''میں نے عہد نامۂ عتیق میں موجود ایک پیشین گوئی پر اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ جو تقریباً ایک سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کتاب ''غزل الغزلات'' میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام ایک آنے والے پیغمبر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی شکل و صورت ایسی ہو گی، ان کی عادات ایسی ہوں گی اور وہ کیسے عظیم الشان کارنامے سرانجام دیں گے۔ اس طرح شمائلِ نبوی یوں بتاتے چلے جاتے ہیں جیسے وہ پیغمبرِ اسلام کو بچشمِ سر دیکھ رہے ہوں اور آخر میں کہتے ہیں کہ یہ ہے میرا وہ پیارا جو آئے گا۔ آنحضرت کے لیے عبرانی زبان میں وہ جو لفظ استعمال کرتے ہیں وہ ہے محمدیم۔ اردو بائبل میں اس کا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ترجمہ ''سراپا عشق انگیز'' کیا گیا ہے اور انگریزی میں اس کا ترجمہ 'altogether desirable' یا 'altogether lovely' کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لفظ اسم علم کے طور پر استعمال ہوا ہے، صفت کے طور پر نہیں۔ اور یہاں اس کا کوئی متبادل یا ترجمہ نہیں بلکہ اصل عبرانی لفظ محمدیم (حضرت محمد) ہی لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ لفظ اب بھی عبرانی نسخوں میں موجود ہے۔ اور میں نے اس پر تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے متعدد حوالے دیے ہیں۔''

''اس معاملے میں اہلِ کتاب کا کیا موقف ہے؟ کیا وہ اسے پیغمبرِ اسلام کے متعلق پیشین گوئی مانیں گے؟''

''جہاں تک اس پیشین گوئی کا تعلق ہے تو اس میں رتی بھر شبہ نہیں کہ اس کا مصداق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا اور یہ بات بھی نہیں کہ غزل الغزلات کو بائیبل کا حصہ تسلیم نہیں کیا جاتا، البتہ جس طرح مختلف مسیحی علما بائیبل کے ہر حصے پر کوئی نہ کوئی اعتراض وارد کرتے ہیں، اسی طرح اسے بھی عجیب وغریب تاویلات کی خراد چڑھا کر اس کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے ایسے کئی مستشرقین کی تحریریں دیکھی ہیں جو پیغمبرِ اسلام کے بارے میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ میں جو صفات ہیں، وہ کسی پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہیں اور یہ بھی دلچسپ صورتِ حال دیکھنے میں آئی ہے کہ ایک مستشرق نے اگر آپ پر کوئی اعتراض کیا ہے تو دوسرا اس کا جواب دیتا ہے۔ میں نے اس حوالے سے بھی ضمنی طور پر کام کیا ہے۔ بہت سے مستشرقین بحُیرا راہب کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ وہ ذاتِ شریف ہے جس سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ''کاروبارِ نبوت'' سیکھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قصے کی روایات نہ سنداً قابلِ اعتنا ہیں اور نہ درایتاً ان کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ سارا واقعہ ہی من گھڑت ہے۔ نہ یہ سفر ہوا اور نہ آنحضرت کی کسی بحیرا نامی شخص سے ملاقات ہوئی۔ ان موضوعات پر بھی میں نے کام کیا ہے۔''

اس موقع پر ہم نے پیشین گوئی کے حوالے سے ایک اور سوال کیا: ''کیا کوئی ایسا واقعہ ہے کہ بائیبل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئی پڑھ کر کوئی غیر مسلم اسلام لے آیا ہو؟''

''اس دور میں تو اس طرح کے متعدد واقعات ہوئے ہیں۔ مثلاً ملیشیا کے عبد الاحد داؤد۔ وہ بہت بڑے پادری (بشپ) تھے مگر بائیبل کے غیر جانبدارانہ معروضی مطالعے نے انھیں مسلمان کر دیا۔ اصل میں خاندانی مذہب کا انسان پر اس قدر گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کو چھپا دیتا ہے۔ ورنہ بائیبل تو پیغمبرِ اسلام کے بارے میں زبانِ حال سے پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ مثلاً انجیل یوحنا کے باب

چودہ، پندرہ اور سولہ کو دیکھیے۔ یہ ابواب پیغمبرِ اسلام کے بارے میں اس قدر واضح ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ حضرت مسیح بار بار فرما رہے ہیں کہ میں جاؤں گا تو وہ آئے گا۔ یعنی میں اور وہ کے الفاظ میں۔ اپنے لیے متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہیں اور رسول اللہ کے لیے غائب کا۔ مگر یہ لوگ ان دونوں صیغوں سے مراد حضرت عیسیٰ ہی کو لیتے ہیں کہ عیسیٰ جائے گا اور عیسیٰ یا روح القدس آئے گا۔ عقل باور نہیں کرتی کہ کوئی ذی شعور انسان یہ تاویل کیسے کر سکتا ہے۔"

اس موقع پر ہمیں انجیل برناباس کا خیال آیا کہ اس میں بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بڑی واضح پیشین گوئیاں موجود ہیں، لیکن عیسائی اس انجیل کو مسلمانوں کی خود ساختہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں ہم نے غوری صاحب سے پوچھا تو وہ بولے:

"انجیل برناباس میں کم از کم چودہ مرتبہ پیغمبرِ اسلام کا نامِ نامی لے کر پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اس کے بیشتر مضامین بہت عمدہ ہیں۔ میں پوری انجیل کی بات نہیں کر رہا، تاہم اس کا بڑا حصہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی اللہ کا کوئی پیغمبر بات کر رہا ہے، لیکن عیسائی چونکہ اسے قابلِ اعتنا نہیں گردانتے، اس لیے میں نے اس سے کوئی استشہاد نہیں کیا۔ دراصل عیسائیوں کی علمی اور تصنیفی تاریخ میں کسی کتاب کے متعلق یہ یقین سے نہیں کہا جاتا کہ یہ کس نے لکھی یا مرتب کی۔ ہر ایک نام کے بارے میں اختلاف موجود ہے، یعنی یقینی طور پر آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے جو اصول (Canon) ہیں جن پر وہ انجیلوں کو پرکھتے ہیں یہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ ایک انجیل برناباس موجود تھی اور برناباس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ میرے نزدیک یہ ان کے بارہ حواریوں (Twelve Disciples) میں سے تھے اور حواریوں کی بعض فہرستوں میں ان کا نام شامل ہے، لیکن عیسائی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ موجودہ انجیلوں میں موجود فہرستوں میں ان کا نام بارہ حواریوں میں نہیں آتا، لیکن بعض دوسری فہرستوں میں یہ موجود ہے۔"

اس موقع پر بلال صاحب نے سوال کیا: "عیسائیوں کے اس انجیل کو نہ ماننے کے کیا اسباب ہیں؟"

دراصل ان کا موقف یہ ہے کہ انجیل برناباس مسلمانوں کی تصنیف ہے، لیکن یہ الزام غلط ہے۔ اگر یہ مسلمانوں کی تصنیف ہوتی اسے بہت پہلے پیش کیا جا چکا ہوتا جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس انجیل کو خود عیسائیوں نے ڈھونڈا ہے۔ اصل میں یہ مسلّم بات ہے کہ حضرت برناباس کی انجیل یقینی طور پر موجود تھی اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کی رد (Rejected) کی ہوئی انجیلوں کی فہرست میں اس انجیل کا

نام موجود ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس نام کی انجیل موجود ہی نہیں تھی تو اس کو مسترد کیسے قرار دیا گیا۔ اس کا ممنوع قرار دینا اس کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے، عیسائیوں کے ایک پوپ ہیں جیلاشس۔ ان کا فرمان ''جیلاشین ڈکری'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں باقاعدہ اسے مسترد کردہ کتب میں شامل کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پابندی عائد کرنے یا ممنوع قرار دینے کی وجہ کیا ہے؟ یقینی طور پر اس میں کوئی ایسی بات موجود ہے جو ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ جس کی وجہ سے اس پر پابندی لگائی گئی۔ وہ کیا بات تھی؟ اس کو جاننے کے لیے ہمیں برناباس کی حقیقت جاننا ہوگی۔

خود لفظ برناباس غور طلب ہے، بناس یا نبا کا مطلب ہے نبوت اور پیشین گوئی۔ اس طرح برناباس کا مطلب بنا، نبوت والا یا خوش خبری دینے والا۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ 'Son of Prophecy' کیا جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ حضرت برناباس کا اہم فریضہ یہ تھا کہ وہ پیغمبرِ اسلام کے متعلق پیشین گوئی بیان کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آخری تعلیم ہی یہ تھی کہ میرے جانے کے بعد جو آنے والا ہے اسے مانا جائے اور اس بات کا اعلان برناباس کرتے تھے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ان کا نام پیشین گوئیوں والا یا خوش خبری دینے والا پڑ گیا۔ اور دورِ اول میں برناباس کی انجیل کو رد کرنے کی وجہ اس میں موجود توحید تھی۔ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی ابنیت کی نفی ہے۔ اور یہ پال کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔''

اس موقع پر بلال صاحب نے کہا: ''انجیل برناباس کے متعدد مقامات پر آنحضرت کے متعلق بعض ایسے اوصاف اور فضائل بیان ہوئے ہیں جن کا ذکر ضعیف اور موضوع روایات میں ہوا ہے؟''

غوری صاحب کہنے لگے: ''اصل میں جب کوئی انجیل لکھی جاتی تھی تو اس کی شرح و وضاحت بھی کی جاتی تھی۔ مگر اگلے ایڈیشن میں یہ شرح و وضاحت اسی انجیل کا حصہ بن جاتی۔ یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا، بلکہ خود عیسائی علما اسے تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ جب اندلس میں اس انجیل کے بارے میں معلوم ہوا ہو تو کسی خوش اعتقاد اور ناپختہ صاحبِ علم مسلمان نے اس کی شرح لکھی ہو اور بعد میں یہ شرح بھی اسی کا حصہ بنا دی گئی ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود میں نے اس انجیل کی پیشین گوئیوں کو موضوعِ تحقیق نہیں بنایا، بلکہ میں نے ان کتابوں اور حوالوں کو موضوع بنایا ہے جو عیسائیوں کے ہاں تسلیم شدہ ہیں۔''

انجیل برناباس پر غوری صاحب کے اس تبصرے کے بعد ہم نے اس پر مزید گفتگو لاحاصل سمجھی اور پوچھا: ''کیا یہ بات حقیقت ہے کہ پال کی ابنیت کے عقیدہ کے علی الرغم عیسائیوں کے ہاں توحید کا عقیدہ بھی رائج رہا

ہے۔ کیونکہ حبشہ کے نجاشی اور حضرت سلمان فارسی کی داستان سے اسی طرح کے عیسائیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ کیا اس وقت بھی عیسائیوں کا ایسا کوئی فرقہ ہے جو توحید پر ایمان رکھتا ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابنیت کو نہ مانتا ہو؟"

"خالص توحیدی عقائد تو شاید کسی کے نہ ہوں لیکن جدید پڑھے لکھے لوگ اس کی طرف آرہے ہیں۔ یہ ایک بہت اہم پیش رفت ہے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تو نواحِ عرب کے متعدد لوگ حضرت عیسیٰ کی ابنیت کے منکر تھے اور توحید پر ایمان رکھتے تھے۔"

اس موقع پر ہمارے ذہن میں عیسائیوں کے دو اہم فرقوں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے نام آئے تو ہم نے غوری صاحب سے گزارش کی کہ وہ ان کے درمیان فرق کو واضح کریں؟

"کیتھولک فرقے کی پاپائے روم کے ساتھ غیر مشروط اطاعت ہے اور اس میں کتاب یعنی بائیبل کا دخل کم ہوتا ہے اور پوپ کے ارشادات کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کتاب کی تعبیر و تشریح کا حتمی اختیار بھی پوپ کو حاصل ہے اور اس کے متعین کردہ مفہوم کو کسی جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ پھر پندرھویں سولھویں صدی عیسوی میں جرمنی میں ایک شخص مارٹن لوتھر (۱۴۸۳تا۱۵۴۶) نے ایک زوردار تحریک شروع کی اور کہا کہ اصل حیثیت کلامِ الٰہی کو حاصل ہے۔ اس نے پوپ کی اس اجارہ داری پر احتجاج یعنی 'Protest' کیا۔ یوں یہ لوگ 'Protestant' کہلائے۔ اصل میں کیتھولک کتاب کو عام کرنے کے بڑے خلاف تھے۔ انھیں یہ خدشہ تھا کہ اگر کتاب کو عام کر دیا گیا تو ان کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ اس موقع پر لوتھر کے ایک ہم عصر انگریز ٹنڈل (۱۴۹۴تا۱۵۳۶) کا ذکر بے محل نہ ہوگا 'Tyndale' نے بائیبل کی اشاعت کے سلسلے میں گراں قدر قربانیاں دیں اور ناقابل بیان اذیتیں برداشت کیں۔ اس نے اس عزم کا اظہار کیا کہ میں ایک عام کسان لڑکے کو بھی اتنی بائیبل سکھادوں گا کہ وہ اسے پادریوں سے بھی زیادہ سمجھنے لگے گا۔ اس نے جلاوطنی برداشت کی۔ قید و بند میں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ اسے زندہ جلانے کی سزا دی گئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ بائیبل سمگل ہو کر برطانیہ پہنچا۔ مصلحین کی قربانیاں رائیگاں نہ گئیں اور بائیبل کے ترجمے اور تعلیمات کی اشاعت عام ہوئی۔'

اس موقع پر ہمارے ذہن میں ایک دوسری تحریک کا خیال آیا جو امریکہ میں سائنسی علوم کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دوران میں وجود میں آئی جس کا بنیادی مقصد سائنس کے مقابلے میں بائیبل کا دفاع تھا اور جسے بنیاد پرستی (Fundamentalism) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق غوری صاحب سے

سوال کیا تو وہ کہنے لگے:

''دراصل اس تحریک کے متعلق معلومات میرے دائرۂ تحقیق میں شامل نہیں۔ البتہ نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے یہ بات میں بتائے دیتا ہوں کہ جب بائیبل کے نظریات کے بالکل برعکس سائنسی حقائق سامنے آئے تو پڑھے لکھے طبقے میں بائیبل اور مذہب کو عملی زندگی سے نکالنے کا عمل شروع ہو گیا اور اسی زمانے میں خود عیسائی اہلِ علم میں ایسے مصلح (Reformers) سامنے آئے جنھوں نے بائیبل کا تنقیدی مطالعہ شروع کیا جبکہ بعض لوگوں نے ایسے مطالعے کی مخالفت کی اور بنیاد پرستی کی روش اپنائی۔''

موجودہ بائیبل کے بارے میں ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں شامل کسی کتاب یا تحریر کی تصنیفی تاریخ معلوم نہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ انھیں کلی طور پر خود ساختہ بھی نہیں کہا جا سکتا تو پھر کون سی رائے قرینِ صواب ہے؟''

''ان کے بارے میں محتاط ترین رائے یہی ہو سکتی ہے کہ یہ نبیوں کے قریبی ساتھیوں کی روایت کی ہوئی باتیں ہیں۔ ان میں حقیقت کے ساتھ ساتھ زیبِ داستان کے لیے بھی بہت کچھ بڑھایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر پڑھتے ہوئے آدمی پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور دل گواہی دیتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام اور نبی کا فرمان ہی ہو سکتا ہے اور بعض جگہوں پر اخلاق سے گری ہوئی ایسی باتیں ہیں جو کسی محفل میں بیان ہی نہیں کی جا سکتیں، لیکن اہلِ کتاب یہ ایمان رکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں، انھیں اللہ اور روح القدس کی تائید حاصل تھی۔ اللہ نے ان کے قلم سے کسی ایسی بات کو نکلنے ہی نہیں دیا جو اس کی مرضی کے خلاف تھی۔ یوں وہ اقرار کرتے ہیں یہ کلام من و عن کلامِ الٰہی 'Word of God' تو نہیں لیکن بہر کیف جو کچھ لکھا گیا وہ اللہ کی طرف سے ان پر نازل ہوا یا کم از کم اللہ ان کے کلام پر نگہبان تھا۔''

قرآنِ مجید میں جہاں عیسائیوں کے اس باطل عقیدے کا تذکرہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ گردانتے ہیں وہاں یہودیوں کے دیگر جرائم میں ایک یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت عزیر کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہیں۔ اس پر یہودی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہودیوں میں اس طرح کا عقیدہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ ہم نے غوری صاحب سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے بتایا:

''قرآن مجید نے یہ بات اپنے مخاطب یہودیوں سے کہی تھی۔ یہ یہودی اصل یہودیوں سے الگ تھے یعنی ان کے 'Main stream' میں نہیں تھے۔ ان کے بارے میں یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نسلاً یہود بھی

تھے یا نہیں۔اس لیے انھیں غیر اسرائیلی یہود (Gentile) کہتے ہیں۔ان کے ہاں نہ تو یہودیوں کی ساری کتابیں موجود تھیں نہ یہ ان تمام عقائد کے حامل تھے جو اصل یہودی مانتے تھے ان کا اصل یہودیوں سے رابطہ بھی نہ تھا۔بلکہ یہ زیادہ تر عربوں کے ساتھ رہتے تھے اور ان کے عقائد سے متاثر بھی تھے۔حضرت عزیر جو اللہ کے نبی تھے اور یہود کے بہت بڑے مصلح، عرب کے یہودیوں نے ان کی عظیم خدمات کی بنا پر انھیں ابن اللہ کہنا شروع کر دیا۔اگر یہ بات غلط ہوتی تو قرآن کے مخاطب یہود فوراً اس کی تردید کرتے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور قرآن نے جہاں حضرت عزیر والی بات کی ہے، وہاں یہی الفاظ ہیں کہ ''یہودی'' حضرت عزیر کے متعلق بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔چنانچہ قرآن کے الفاظ پر اعتراض کرنے والے یا تو اس پس منظر سے واقف نہیں یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں اور محض اعتراض کرنے کی غرض سے معترض ہوتے ہیں۔''

اس شافی جواب کے بعد آخر میں ہم نے غوری صاحب سے دریافت کیا کہ وہ اپنا کتنا کام مکمل کر چکے ہیں اور یہ کام کس زبان میں کر رہے ہیں وہ بولے:

''میں اپنا سارا کام انگریزی زبان میں کر رہا ہوں اور مناسب ہوا تو اس کا اردو ترجمہ بھی کروں گا ابھی میں عہد نامۂ عتیق پر کام کر رہا ہوں۔اور عہد نامۂ جدید یعنی اناجیل کی باری بعد میں آئے گی در اصل میں نے جو کام کیا ہے، وہ یہ بات پیشِ نظر رکھ کر کیا ہے کہ پہلے ہو چکے ہوئے کام کو آگے بڑھایا جائے اور انھی حوالوں اور کتابوں کو سامنے لایا جائے جو اہلِ کتاب کے ہاں مستند اور قابل قبول ہیں۔ان شرائط اور حدود و قیود نے اس کام کو خاصا مشکل بنا دیا ہے۔مزید یہ کہ اپنے طور پر تو میں یہ کام پچھلے پندرہ برسوں سے کر رہا ہوں، لیکن پچھلے دو برسوں سے یہ میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ میرے پاس مواد بھی خاصا ہے۔کتابوں کا جو ذخیرہ اس وقت میری ذاتی لائبریری میں ہے، وہ شاید پاکستان میں نہ کسی عالم کے پاس ہو گا اور نہ مسلمانوں کی کسی لائبریری میں۔اور میں نے جو کام مکمل کر لیا ہے عنقریب وہ شائع بھی کیا جا رہا ہے۔''

غوری صاحب سے اگرچہ اس موضوع پر مزید تفصیل سے گفتگو ہو سکتی تھی، لیکن اسے ہم نے کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھا اور ہمارے اظہارِ تشکر پر یہ دلچسپ، مفید اور معلومات افزا گفتگو اختتام پذیر ہوئی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

افسانہ

طالب محسن

فریادی

ایک فریادی اپنے بیٹے کے ساتھ بادشاہ کے دربار میں پہنچا، بادشاہ تختِ حکومت پر بیٹھا تھا، حاضرین پر ہیبت طاری تھی، فریادی نے دہائی دی: اے بادشاہ تیری حکومت بے مثال ہے۔ تیرے خزانے بے پناہ ہیں۔ تیرے ایک اشارے سے میری بگڑی سنور سکتی ہے۔ تو مانگنے والوں کو دیتا ہے۔ تو ضرورت مندوں کا حاجت روا ہے۔ سارے دولت مند تیرے دیے ہوئے سے دولت مند ہیں۔ میں بھی تیرے در پہ آیا ہوں۔ میری فریاد سن۔ میری حاجت پوری کر۔

بادشاہ نے فریادی کی بات سنی اور اسے اس کی تمنا سے کہیں زیادہ دے دیا۔ فریادی نہال ہو گیا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ فریادی کا بیٹا یہ سب کچھ حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے دربار میں کوئی بات نہیں کہی تھی۔ جب دونوں باہر نکلے تو اس نے کہا: اباجان ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ باپ نے بیٹے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ بیٹے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: اگر آپ کی رسائی بادشاہ کے دربار تک ہے تو پھر آپ دوسروں سے کیوں مانگتے ہو۔ ہمیں دربار تک جانے میں کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بادشاہ تک پہنچنے کے لیے کسی سفارش یا رشوت کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ بادشاہ نے کسی کو اپنا نائب یا مددگار بھی نہیں مقرر کیا۔ جس ملک کا بادشاہ اتنا بااختیار اور اتنا اعلیٰ ہو، اس ملک کی رعایا کا کسی اور کے پاس جانا ظلم نہیں ہے؟

فریادی خاموش رہا۔ وہ شاید کوئی بات نہیں بنا پا رہا تھا یا اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

باپ اور بیٹا خاموشی سے چل رہے تھے۔ لیکن راستے کے پتھر، درختوں کے سائے، پھولوں کی مہک، پرندوں کے نغمے، ہر ہر شے ایک ہی بات کہہ رہی ہے:

بادشاہ سب سے برتر ہے، بادشاہ سب کی سنتا ہے۔
فریادی ظالم ہے، اسی لیے دردر کی ٹھوکریں کھاتا ہے۔

نفرت کا علاج

بصاری کے شہر میں کبھی ایک بہت ہی رحم دل شہزادہ آباد تھا۔ جس سے ساری رعایا پیار کرتی تھی۔ جس کی ساری رعایا دل سے عزت کرتی تھی۔ مگر اسی شہر میں ایک ایسا قلاش بھی رہتا تھا جسے شہزادے سے بڑی نفرت تھی اور وہ ہمیشہ اس کے خلاف زہر اگلتا رہتا تھا۔

شہزادے کے کانوں تک یہ سب کچھ پہنچ تو جاتا لیکن پھر بھی وہ خاموش رہتا۔ آخر اس کا علاج یہ نکالا کہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی رات، اپنے غلام کو آٹے کی ایک بوری، صابون کا ایک گٹھا اور شکر کا ایک توڑا دے کر اس قلاش کے یہاں بھیجا۔

غلام نے اس قلاش سے جا کر کہا: شہزادے نے یہ سب کچھ حضور کی خدمت میں بھیجا ہے۔

قلاش یہ سن کر پھولا نہ سمایا اور یہ سمجھ کر اترا گیا کہ شہزادے نے اسے نذرانہ بھیجا ہے۔ اسی گھمنڈ میں وہ مفتی کے پاس پہنچا اور شہزادے کے تحائف کی تفصیل بتا کر کہنے لگا: ''دیکھا نا شہزادے کو میری خوش نودی کس قدر منظور ہے!'' مفتی یہ سن کر مسکرایا۔

''ہاں میں نے دیکھا کہ کس قدر دانش مند ہے، شہزادہ اور کس قدر بے وقوف ہو تم۔ لیکن تم نہیں سمجھے کہ وہ باتیں استعاروں میں کرتا ہے۔ آٹے کی بوری یہ تمھارے خالی پیٹ کے لیے ہے۔ صابن میلے لباس کو اجلا کرنے کے لیے ہے اور شکر کڑوی زبان کو شریں بنانے کے لیے!''

اس دن سے اس قلاش کو خود اپنے آپ سے نفرت ہو گئی، مگر شہزادے کے خلاف جو کدورت تھی اس کی شدت پہلے سے بھی بڑھ گئی.... اور اس مفتی کو تو وہ زہر سمجھنے لگا جس نے اس شہزادے کی عظمت کا راز اجاگر کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس قلاش نے اپنی زبان سے کبھی شہزادے کے خلاف کچھ نہیں کہا۔

(کلیاتِ خلیل جبران، ص۲۹۶)

خیال و خامہ

جاوید

O

جلووں کی آرزو نہ تقاضا تھا طور کا
اب کیا گلہ ہو اُن سے دلِ ناصبور کا

فرصت ملے تو درد کا درماں ہے آج بھی
فصلِ بہار میں کوئی نغمہ طیور کا

پیتے ہیں اُن کے ہاتھ سے قرآں میں روز و شب
کیا رنگ ہے ہماری شرابِ طہور کا

کھلتا نہیں کہ بستۂ تقدیر ہے ابھی
یہ سلسلہ جہاں غیاب و حضور کا

صوفی پہ کس لیے ہے گراں، جانتا ہوں میں
عقبیٰ میں ذکر بادہ و غلماں و حور کا

مشکل تھا، کر لیا مگر ہم نے معاملہ
عقل و خرد سے مستی و شوق و سرور کا

انساں، مگر حقیقتِ انساں سے بے خبر
حاصل یہی ہے وسعت علم و شعور کا؟

نغمہ سرا ہے بزم تو ایسی کوئی صدا
برپا ہو جس سے غلغلہ صبحِ نشور کا

طے کر لیا ہے نیمۂ شب کے سجود میں
ورنہ زمیں سے عرش کا رستہ تھا دور کا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com